فکر و نظر--- اسلام آباد		جلد: ۴۲		شمارہ: ۳

قرآن کا تصورِ انسان

ڈاکٹر خالد علوی☆

انسان

کائنات گوناگوں موجودات کا مرقع ہے اور ایک سے بڑھ کر قدرت کی کرشمہ سازی کا مظہر ہے۔ لیکن ہمارے پیش نظر موجودات کی تفصیلی بحث نہیں۔ ہم سہولت کے لیے صرف فلاسفہ کی اس تقسیم کا ذکر کرتے ہیں جو ہمارے موضوع سے قریبی تعلق رکھتی ہے۔ فلاسفہ نے اشیاء کائنات کو تین نام دیئے ہیں۔ جمادات، نباتات اور حیوانات یعنی ٹھوس مادے اور پھر وہ جن کے اندر نشو و ارتقاء ہوتا ہے، تیسری قسم میں وہ جن میں نشوو و ارتقاء کے ساتھ حرکت و ارادہ بھی پایا جاتا ہے۔ پس آخری قسم میں مخلوق کی وہ نوع بھی ہے جس میں تمام حیوانی اوصاف کے ساتھ عقل و شعور اور سلیقۂ گفتار کے جوہر بھی موجود ہیں۔ کائنات کی یہی انوکھی مخلوق ہے جو علم الاجتماع میں خصوصی موضوع کی حیثیت رکھتی ہے اور یہ حضرت انسان ہیں جو شاہکار فطرت ہیں۔ لیکن دوسری طرف یہ پستیوں کی انتہاء تک بھی پہنچ جاتے ہیں۔ انسان کی شخصی اہمیت کے پیش نظر اس کے مقام کو متعین کرنے کی کوشش کی جاتی رہی ہے۔ مشاہدہ بتاتا ہے کہ انسان متضاد کیفیتیں رکھتا ہے وہ ظالم و مظلوم، عالم و جاہل، عابد و معبود، شاہ و غلام، صاحب اقتدار اور بے بس سب کچھ ہے۔ اس کی انہی متنوع خصوصیات کی وجہ سے علمائے اجتماعیت کو دقت پیش آتی ہے کہ کس انسان کو نمائندہ تسلیم کیا جائے؟ وہ یہ سوچنے پر مجبور ہوئے کہ انسان کی فضیلت کیا ہے؟ اس کا حقیقی مقام کیا ہے؟ مقام انسانی کو متعین کرنے کی کوششیں دو قسم کی ہیں۔ ان لوگوں کی کوشش جو مذہب کو بنیاد تصور نہیں کرتے اور ان لوگوں کی جو مذہب کو بنیادی سرمایہ تصور کر کے چلتے ہیں۔ ان کوششوں کا مختصر جائزہ لینے کے بعد ہم اس حیثیت میں ہوں گے کہ اسلام کا نقطۂ نظر بیان کریں۔

غیر مذہبی کاوشیں

انسان چونکہ حیوانی قوتیں بھی رکھتا ہے اس لیے غیر مذہبی ذہنوں کو انسانی تخلیق اور اس کی

جوڑ دیا۔ ڈارون[1] نے اپنے نظریہ ارتقاء میں کہا کہ زندگی کا آغاز نچلی سطح سے مختلف (Species) انواع کے ذریعہ ہوا۔ اس کے بعد تمام انواع میں ارتقاء کا سلسلہ شروع ہوا۔ ارتقاء خالصتاً میکانکی قوانین کی رو سے ظہور پذیر ہوا۔ ان قوانین میں طبعی انتخاب (Natural Selection) ماحول کے ساتھ مطابقت (Adoptability to the enviroment) اور بقاء اصلح (Survival of the fittest) یہ آخری اصطلاح ڈارون نے ہربرٹ سپنسر (Herbert Spencer 1820-1903) سے مستعار لی ہے۔

ہر نوع آہستہ آہستہ ارتقائی مراحل طے کرتی رہی، کمزور اور غیر صالح فنا ہوتی رہیں اور صلاحیت والی انواع باقی رہیں اور بالآخر انسانی پیکر وجود میں آیا۔ انسان بھی میکانکی قوانین کے مطابق جی رہا ہے اور انہی قوانین کے مطابق ختم ہو جائے گا۔ اس نظام ارتقاء میں کسی خارجی قوت کا کوئی ہاتھ نہیں ہے اور نہ ہی اس میں کوئی مقصدیت پائی جاتی ہے۔ حیات کی یہ تعبیر مادّیین (Materialists) ہی کے فلسفہ پر کی گئی ہے۔ Vitalists کا گروہ جس کا ایک نمائندہ مشہور جرمن فلسفی برگساں (Henry Bergson) ہے۔ اس نے نظریہ ارتقاء کو مابعدالطبعاتی قوت سے جوڑنے کی کوشش کی۔ اس کا کہنا ہے کہ یہ تمام کائنات کسی ہستی کے مقرر کردہ پروگرام کے مطابق ایک خاص مقصد کے تحت ظہور میں آئی ہے اور ارتقاء وغیرہ اس منزل کی طرف بڑھنے کے ذرائع ہیں جو میکانکی طور پر پیدا نہیں ہوگئے۔ برگساں اس قوت کا نام (Elanvital) رکھتا ہے۔ اس نظریہ پر تنقید کرتے ہوئے گلیلوے (Galloway) کہتا ہے!

جب تم کسی چیز کو علت و معلول کے تمام قاعدے کے رو سے سمجھا نہ سکو تو اس کا آسان طریقہ یہ ہے کہ یہ کہہ دو کہ فطرت یا خالق فطرت نے یہ سب کچھ کسی خاص مقصد کے تحت کیا ہے۔[2]

جن لوگوں نے اس نظریہ کو تسلیم نہیں کیا انہوں نے بھی بنیادی حیوانی خواہشات ہی کو انسانی اعمال کا ضابطہ قرار دیا ہے۔ اس سے انسان کی حیثیت کا ایک پہلو تو واضح ہوگیا لیکن ظاہر ہے کہ انسان کا فقط یہی ایک پہلو تو نہیں۔ پھر انہوں نے بقائے اصلح (Survival of the fittest) کے اصول سے انسان کے مفید اور غیر مفید ہونے کا جو مادی معیار مقرر کیا وہ بھی ایسا نہیں ہے کہ اسے ابدی اصول بنا لیا جائے اور اگر اس کو تسلیم کر لیا جائے تو بھی اس سے انسان کی مجموعی حیثیت متعین

فلسفہ مادیت کے پیرو کائنات کی مادی تعبیر رکھتے تھے، اس لیے انہوں نے انسان کو بھی میکانکی نقطہ نظر سے دیکھا گویا انسانی جسم ہی سب کچھ ہے اور انسان بھی طبعی قانون علت و معلول کے ماتحت میکانکی طور پر ظہور پذیر ہوتا رہتا ہے۔ لہذا انسان صاحب اختیار و ارادہ نہیں بلکہ میکانکی قوانین کی محسوس و غیر محسوس زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔

بعض دوسرے لوگوں نے انسان کی فطرت کا تجزیہ کر کے اس کی جبلتوں کا کھوج لگایا اور نتیجہ یہ نکالا کہ جنس و شکم پر ہی اس کی تمام تر جدوجہد کا دارومدار ہے۔ کبھی کبھی ان جبلتوں کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہ بے ہنگم حرکتیں بھی کر بیٹھتا ہے مگر اکثر اوقات سلجھے ہوئے طریقے پر اپنی ضروریات کو خوش سلیقگی سے ترتیب دیتا اور خواہشات کی تکمیل کے لیے نئے اسلوب اختیار کرتا ہے، میکانکی تصور کے بارے میں علامہ اقبالؒ لکھتے ہیں:

> زندگی کا مسئلہ ایک منفرد مسئلہ ہے اور اس کے تجزیے کے لیے میکانکی تصور بالکل ناکافی ہے۔ ڈریش (Driesch) کی اصطلاح میں اس کی (Factual Wholeness) ایک ایسی وحدت ہے جو ایک اور نقطہ نگاہ کے مطابق کثرت بھی ہے۔ زندگی ایک مقصد کے لیے نشوونما پاتی ہے اور اسی مقصد کے لیے اپنے ماحول سے تطابق اختیار کیے جاتی ہے (خواہ یہ تطابق نئے عادات و اطوار اختیار کرنے سے حاصل ہو یا قدیم عادات میں رد و بدل کر لینے سے) اس طرح زندگی ایک (Career) کی حامل بن جاتی ہے اور مشین کے لیے (Career) کا تصور ہی ناممکن ہے۔ Career کے حامل ہونے کا مطلب یہ ہوا کہ اس کی عملی قوتوں کا سرچشمہ بہت دور زمانہ ماضی میں واقع ہے جس کی ابتداء ایک روحانی حقیقت (Spiritual Reality) سے ہوتی ہے جسے کوئی مکانی تجربہ (Special experiment) دریافت نہیں کر سکتا۔ البتہ وہ حقیقت اپنے آپ کو مکانی تجربہ پر واشگاف کر سکتی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ زندگی ایک بنیادی حقیقت ہے اور طبیعاتی اور کیمیائی طریق عمل کی ابتداء سے پہلے موجود ہے۔ اس طریق عمل کے متعلق اتنا سمجھ لینا چاہیے کہ یہ زندگی کا ایک متعین عمل ہے جو اس نے ارتقاء کے طولانی دور میں اختیار کر لیا ہے۔ (۳)

سائنس زندگی کا احاطہ نہیں کر سکتی (سائنس صرف مشینوں کا احاطہ کر سکتی ہے جو بندھے ہوئے قواعد کے ماتحت نقل و حرکت کرتی ہیں) علم الحیات کا وہ ماہر جو چاہتا ہے کہ زندگی کی میکانکی تعبیر مل جائے وہ اس لیے کرتا ہے کہ وہ اپنے مطالعہ کو زندگی کی ابتدائی اور پست سطح تک محدود رکھتا ہے جہاں وہ دیکھتا ہے کہ زندہ اشیاء کا طور طریق مشین سے ملتا جلتا ہے۔ اگر وہ اس زندگی کا مطالعہ کرے جس کا مظہر خود اس کی ذاتی ہے۔ یعنی وہ اپنے اس دل کا مطالعہ کرے جو اپنے لیے آپ فیصلے کرتا ہے، کسی چیز کو اختیار کرتا ہے کسی کو مسترد کر دیتا ہے، سوچتا ہے ماضی اور حال کا جائزہ لیتا ہے اور ابھرنے والی قوتوں کے ساتھ مستقبل کا تصور کرتا ہے تو وہ یقیناً اس امر کا اعتراف کرے گا کہ زندگی کے متعلق اس کا میکانکی تصور بالکل ناکافی ہے۔(۴)

اگرچہ مغرب میں فلسفیوں نے اس میکانکی تصور کو رد کر دیا ہے اور انسانی نفس (Mind) اور شعور کے حوالے سے شاندار بحثیں کی ہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ انسان کی حیثیت کے بارے میں سب آراء ظن و تخمین پر مبنی ہیں۔ اہل منطق انسان کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ انسان حیوان ناطق ہے۔ گویا وہ حیوان تو ہے لیکن جو چیز اسے حیوان سے ممتاز کرتی ہے وہ نطق ہے لیکن فلاسفہ کے ہاں نطق کے اور امتیازات بھی مثلاً شعورِ ذات (Self conscousness) وغیرہ جاں تک شعور سادہ (Simple conscuosness) کا تعلق ہے وہ تو حیوانات میں بھی پایا جاتا ہے لیکن شعور ذات صرف انسانی خاصہ ہے۔ G. G. Simpson کہتا ہے کہ یہ ٹھیک ہے کہ انسان بھی ایک حیوان ہے لیکن یہ کہنا ٹھیک نہیں کہ انسان صرف حیوان ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ انسان صرف حیوان ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم ان تمام خصائص کے وجود کا انکار کرتے ہیں جو صرف انسان کے اندر ہیں اور باقی حیوانات میں سے کسی میں موجود نہیں۔ اس حقیقت کا اعتراف کرنا نہایت ضروری ہے کہ انسان ایک حیوان تو ہے لیکن اس کی ہستی کی انفرادیت کی بنیاد وہ خصوصیات ہیں جن میں کوئی اور حیوان اس کا شریک نہیں۔ فطرت میں انسان کا مقام اور اس مقام کی بلند ترین اہمیت انسان کی حیوانیت کی وجہ سے نہیں بلکہ اس کی انسانیت کی وجہ سے ہے۔ انسان ایک بالکل نئی قسم کا حیوان ہے۔ ایک ایسا حیوان جس میں اگرچہ طبعی ارتقاء کا سلسلہ بھی جاری ہے لیکن اس میں ایک بالکل نئی قسم کا ارتقا بھی [illegible] (۵)

انسان حیوانی جبلتوں کا مجموعہ

میگڈوگل کے مطابق ایک حیوان کے سارے افعال جبلتوں کے ماتحت سرزد ہوتے ہیں۔ جبلت عمل کا ایک اندرونی حیاتیاتی دباؤ ہے جس کے لیے حیوان کے نظام عصبی یا دماغ میں خاص مراکز موجود ہوتے ہیں۔ ہر جبلت کی قدرتی فضیلت ایک خاص اندرونی یا بیرونی تحریک (Stimulus) کے ماتحت ایک خاص مدعا کے ساتھ اور ایک خاص قسم کی جذباتی کیفیت یا عاطفہ (Emotion) کی ہمراہی میں شروع ہوتی ہے اور جب تک مدعا حاصل نہیں ہو جاتا برابر جاری رہتی ہے۔ جبلتوں کے عمل کی قدرتی غرض یہ ہے کہ فرد کی حیوانی زندگی اور نسل باقی رہے۔ انسان کے اندر بھی وہی جبلتیں ہیں جو اس سے نچلے درجے کے حیوانات میں موجود ہیں کیونکہ جہاں تک بقائے حیات اور نسل کا تعلق ہے انسان کی ضروریات بالکل وہی ہیں جو حیوان کی ہیں۔ وہ کہتا ہے: انسان کے سارے افعال کا اصل منبع اس کی جبلتیں ہیں۔ ہر سلسلۂ خیالات خواہ وہ کیسا خشک اور خالی از جذبات نظر آتا ہو کسی نہ کسی جبلت کی قوت محرکہ کی وجہ سے اپنے مقصد کو پہنچتا ہے۔ ایک انتہائی درجہ کے ترقی یافتہ ذہن کی فکری مشین کے تمام پرزے مل کر صرف ایک ایسے آلہ کی حیثیت رکھتے ہیں جس کے ذریعہ سے یہ جبلتیں اپنی تسلی اور تشفی حاصل کرتی ہیں۔ ان جبلی خواہشات کو ان کے زبردست مادی حیاتیاتی پرزوں سمیت انسانی دماغ سے خارج کر دیجئے تو آپ دیکھیں گے کہ جسم کے لیے ناممکن ہے کہ وہ کسی قسم کی سرگرمی یا عمل کا اظہار کر سکے۔ وہ قطعاً بے عمل اور بے حرکت ہو جائے گا جیسے کہ عجیب و غریب گھڑی جس کی کمانی الگ کر لی گئی ہو۔[۶]

ہم دیکھتے ہیں کہ حیوان کی تمام جبلتیں محبت و جذب سے تعلق رکھتی ہیں یا نفرت و دفع ضرر سے متعلق ہیں۔ حیوان کے تمام افعال جبلتوں سے پیدا ہوتے ہیں اور ان تمام افعال کا حاصل یہ ہے کہ وہ ان چیزوں کی طرف جذب کا اظہار کرتا ہے جو اس کی زندگی اور نسل کو برقرار رکھنے میں ممد و معاون ہوتی ہیں اور ان تمام اشیاء کو دفع کرتا ہے جو اس کی زندگی اور نسل کو برقرار رکھنے کے مقصد میں رکاوٹ پیدا کرنے والی ہوتی ہیں مثلاً جبلت جنس (Sex instinct) جبلت تغذیہ (Feeding) جبلت امومت (Maternal instinct) جبلت اجتماعی (Gragarian) جبلت انقیاد (Submission) سب جذب یا محبت سے پیدا ہوتی ہیں اور جبلت فرار (Flight)، جبلت غضب

ہے جذبہ احترام و عزت (Respect) جس کی بناء پر انسانی اعمال اور رویوں کی تحریک ہوتی ہے۔ اگرچہ بعض ناقدین کی رائے یہ ہے کہ انسان صرف ایک ہی جذبہ رکھتا ہے اور وہ جذبہ محبت ہے نفرت کا جذبہ اسی کے تحت محبوب کی نقیض کے خلافت محبت کی تکمیل اور اعانت کے لیے پیدا ہوتا ہے۔(۷)

اس کا نظریہ ہے کہ انسان ایک حیوان ہے جس کا کوئی فعل ایسا نہیں جو اس کی کسی نہ کسی جبلت کے منبع سے سرزد نہ ہوتا ہو۔ جب تک انسان کو کوئی جبلت نہ اُکسائے وہ کوئی کام کر سکتا ہے اور نہ ہی کسی کام کے متعلق سوچ سکتا ہے۔ میکڈوگل کے نزدیک حیوان اور انسان میں صرف ایک ہی امتیاز ہے اور وہ یہ کہ انسان میں عقل کا وصف ہے اور حیوان میں نہیں۔ حیوانی جبلتوں کا نظام انسان میں ایک جذبہ پیدا کرتا ہے جو حالات اور واقعات کے تحت ارتقاء پذیر ہوتا ہے۔ اتفاقاً جبلتیں مل کر ایک جذبہ ذات اندیشی پیدا کرتی ہیں جو اس کے جملہ اقدامات کا محرک ہوتا ہے۔ لیکن غور طلب بات یہ ہے کہ جذبہ ذات اندیشی انسان ہی کے ساتھ کیوں مختص ہے ان جبلتوں کے ذریعہ یہ حیوان میں کیوں نہیں پیدا ہوتا۔ ظن و تخمین پر مبنی دانشوری سے اسی طرح کا کنفیوژن پیدا ہوتا ہے۔

انسان ایک مغلوب الشہوت حیوان

فرائڈ نے انسانی شخصیت کا تجزیہ اس کی جنسی خواہش سے کیا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ انسان کی ایک ہی جبلت کام کر رہی ہے وہ جنسی خواہش (Sexual desire) ہے۔ اس نے اس تصور پر مبنی شخصیت کا ایک ہیولیٰ تیار کیا ہے جس میں لاشعور، شعور اور فوق الشعور اپنا کام کرتے ہیں۔ وہ کہتا ہے: ''انسانی شخصیت یا نفس انسانی صرف وہی نہیں جسے ہم شعور کہتے ہیں اور جس کی مدد سے سوچتے، جانتے اور محسوس کرتے ہیں اور گرد و پیش کے حالات میں تغیر پیدا کرنے کے قابل ہوتے ہیں بلکہ اس کے علاوہ نفس انسانی کا ایک ایسا حصہ بھی ہے جو ہمارے شعور کی سطح کے نیچے موجود رہتا ہے''۔ فرائڈ کے نزدیک انسان کی ساری شخصیت یا نفس انسانی لاشعور ہی ہے اور شعور اس کا ایک جزو ہے جو بیرونی دنیا کا جائزہ لینے کے لیے اوپر ابھر آیا ہے۔ نفس انسانی کی مثال ایسی ہے جیسے سمندر میں تیرتا ہوا برف کا ایک تودہ جو اپنے ایک نہایت ہی قلیل قریباً دسویں حصہ کے سوا تمام کا تمام سطح سمندر سے نیچے ہوتا ہے...... بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ شعور کو لاشعور سے وہی تعلق ہے جو سمندر کی جھاگ کو سمندر

لاشعور میں ایک طوفان تمنا ہر وقت موجزن رہتا ہے اور یہ تمنا ایک زبردست جنسی خواہش ہے جسے یہ مرد اور عورت کا لاشعور غیر متناہی حد تک مطمئن کرنا چاہتا ہے لیکن لاشعور اپنی جنسی خواہشات کو شعور کے ذریعہ پوری کر سکتا ہے لہذا وہ شعور کو مجبور کرتا ہے کہ اس کی تسکین کا سامان پیدا کرے۔ معاشرتی ضوابط کی وجہ سے شعور تعمیل نہیں کر سکتا اور یوں لاشعور کو اپنی خواہشات کو روکنا پڑتا ہے۔ لیکن اس رکاوٹ کے نتیجے میں انسان کو بے چینی اور بے قراری لاحق ہوتی ہے جو دماغی امراض کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ فرائڈ لکھتا ہے:

''لاشعور ابلتی ہوئی خواہش کی ایک دیگ ہے۔ اس کے اندر کوئی نظم اور کوئی سوچا سمجھا ہوا ارادہ نہیں۔ صرف لذت کی خاطر جنسی خواہشات کی تکمیل کا جذبہ ہے۔ منطق کے قوانین بلکہ اضداد کے اصول لاشعور کے عمل پر حاوی نہیں ہوتے۔ مخالف خواہشات ایک دوسرے کو زائل کیے بغیر اسی میں پہلو بہ پہلو ہمیشہ موجود رہتی ہیں۔ لاشعور میں کوئی ایسی چیز نہیں جو نفی سے مشابہت رکھتی ہو اور ہمیں یہ دیکھ کر حیرت ہوئی ہے کہ فلسفی کا یہ دعویٰ کہ وقت اور یہ فاصلہ ہمارے افعال کے لازمی عناصر ہیں، لاشعور کی دنیا میں غلط ہو جاتا ہے۔ لاشعور کے اندر کوئی ایسی چیز نہیں جو وقت کے تصور سے علاقہ رکھتی ہو۔ لاشعور میں وقت گزرنے کا کوئی نشان نہیں اور یہ ایک حیرت انگیز حقیقت ہے جس کے معنی سمجھنے کی طرف ابھی تک فلسفیوں نے پوری توجہ نہیں کی کہ وقت گزرنے سے لاشعور کے عمل میں کوئی تغیر واقع نہیں ہوتا۔ ایسی خواہشات عمل جو لاشعور سے کبھی باہر نہیں آئیں بلکہ وہ ذہنی تاثرات بھی جنہیں روک کر لاشعور میں دبا گیا ہو، لاشعور میں ہر لحاظ سے غیرفانی ہوتے ہیں اور سالہا سال تک اس طرح محفوظ رہتے ہیں گویا ابھی کل وجود میں آئے ہیں''۔

مختصر یہ کہ فرائڈ کے نزدیک انسان ایک مغلوب الشہوت حیوان ہے جسے قدرت نے ذیل کے تین متبادل طریق ہائے کار میں سے ایک کے اختیار کرنے پر مجبور کر رکھا ہے:

۱۔ وہ اپنے لاشعور کی حد درجہ شرمناک جنسی خواہشات کو پوری آزادی اور بے حیائی سے مطمئن کرے۔ بے شک معاشرہ اسے برا سمجھے گا لیکن اسے کوشش کرنی چاہیے کہ وہ معاشرے کی پروا نہ کرے۔

۳۔ وہ اپنی جنسی خواہشات سے قطع نظر کر کے ان کی بجائے مذہب، اخلاق، علم اور ہنر ایسی سرگرمیوں سے اپنے آپ کو دھوکہ دیتا رہے اور اس کے ساتھ ہی خوب یاد رکھے کہ ان سرگرمیوں کی حقیقت ایک وہم سے زیادہ نہیں اور دراصل ان کی اپنی کوئی قدر و قیمت نہیں سوائے اس کے کہ وہ اس کے دکھے ہوئے دل کو بتلائے فریب کرنے کا ایک ذریعہ ہیں۔

انسان احساس تفوق کا مجسمہ

فرائڈ کا شاگرد ایڈلر جو اس کے ساتھ مل کر کام کرتا رہا، اپنے استاد کے ساتھ لاشعور کے وجود پر متفق ہے، اس بات سے بھی اتفاق کرتا ہے کہ مذہب، اخلاق، فلسفہ، علم، ہنر اور انسان کی دوسری اعلیٰ سرگرمیاں معاشرے کے مخترعات ہیں اور ان کی قدر و قیمت فرضی ہے۔ تاہم وہ اپنے استاد سے اس مسئلہ پر اختلاف رکھتا ہے کہ لاشعور میں جنسی خواہش کا طوفان بپا ہے۔ اس کے نزدیک انسان کی زندگی کی ساری تگ و دو کا مقصد یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو دوسروں پر غالب کرے۔ بچپن میں جب وہ اپنے والدین اور دوسرے لوگوں کو دیکھتا ہے تو اپنے آپ کو ان کے مقابلے میں کمزور و ناتواں پاتا ہے اور وہ اپنی قوت اور برتری کی وجہ سے اس پر حکمران ہوتے ہیں اور احساس تفوق اسے مجبور کرتا ہے کہ وہ غلبہ حاصل کرے تاکہ مغلوبیت سے نجات بھی حاصل کرے اور غلبے کے فوائد بھی سمیٹے۔ اس کی ساری زندگی اس تگ و دو میں گزرتی ہے کہ کمزوری کی تلافی کرے اور قوت حاصل کر کے دوسروں کو مغلوب کرے۔ ایڈلر کے نزدیک انسان ایک ایسا وجود ہے جو دوسروں کو مغلوب کرنے کے لاعلاج مرض میں مبتلا ہے۔ ایڈلر کے نزدیک طاقت کی خواہش جذبہ لاشعور کا ایک جزو نہیں بلکہ سارا جذبہ لاشعور ہے۔ اس کے نزدیک طاقت کے علاوہ جو چیز بھی انسان چاہتا ہے وہ طاقت ہی کے لیے چاہتا ہے۔ اس کے نزدیک طاقت انسان کی تمام خواہشات میں سے مرکزی اور بنیادی خواہش ہے۔

اس تفصیل سے واضح ہوا کہ انسان اپنی خواہشات کے لحاظ سے پست سطح کا حیوان ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ وہ صاحب عقل ہے اور خود شعوری کے مقام پر فائز ہے اور اسے یہ فضیلت حاصل ہے کہ وہ عقل کو کام میں لا سکتا ہے۔ اس نقطہ نظر کے مطابق عقل انسانی خواہشات کی ترتیب و تکمیل میں لگی رہتی ہے۔ فی الحقیقت عقل انسانی خواہشات انسانی کی باندی ہے جو ان کے لیے راہیں تلاش کرتی رہتی ہے۔ اس طرح انسان ایک سلجھے ہوئے حیوان سے زائد اور کچھ بھی نہیں۔ مکمل انسان کی

سلجھاؤ اور سلیقہ اپنا لیا تو کیا ہوا یہ کمال انسانیت نہیں ہے۔ کمال انسانیت تو ابھی محتاج بیان ہے۔ اگر ان اصولوں کو تسلیم کر لیا جائے تو روئے زمین پر جو ظلم و زیادتی ہوتی اور جس قدر حقوق پامال ہوتے ہیں وہ کسی نہ کسی حد تک جائز قرار پاتے ہیں۔ بادشاہ، سپہ سلار، امراء اور دوسرے شہ زور لوگ اپنے اپنے مفاد کے لیے جو کچھ کرتے ہیں وہ درست اور انسان جن خواہشات کی تکمیل کرتا ہے وہ بالکل روا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مغربی مفکرین کے ہاں انسان کے بارے میں جو خیالات ہیں وہ کچھ اس طرح ہیں:

ارسطو کے مطابق انسان کی تعریف یہ ہے کہ وہ دو ٹانگوں والا جانور ہے۔ اور روسو کے نزدیک انسان ایک وحشی ہے البتہ اس کو سدھایا جا سکتا ہے۔ ہابز کی رائے میں ایک انسان دوسرے کے لیے بھیڑیا ہے۔ ہیوم انسان کو بدمعاش تصور کرتا ہے اور سارتر کے بقول انسان ایسا جانور ہے جس کو عقل و خرد سے بیگانہ بنا کر دنیا میں پھینک دیا گیا ہے۔ مغربی مفکرین کی رائے کے مطابق اگر انسان ایسا ہی شریر حیوان ہے تو پھر معاشرہ بھی ایسا ہی تخلیق کرے گا۔

میکانکی نظریہ کے مطابق انسان مادی عناصر کی ترتیب سے ظہور میں آ گیا ہے۔ چونکہ مادہ میں ہر آن تغیرات واقع ہوتے رہتے ہیں اسی لیے انسان بھی ہر آن تبدیل ہوتا رہتا ہے اور بالآخر مادی اجزاء کے تشتت و انتشار سے اس کا خاتمہ ہو جاتا ہے لیکن اب یہ خیال ظاہر کیا جا رہا ہے کہ: ''ہر انسان دو ہستیوں کا مجموعہ ہے۔ ایک وہ جو جمادات، نباتات اور حیوانات کا مرکب ہے۔ یعنی وہ انسان جو زمان و مکان کی دنیا میں رہتا ہے دوسرا وہ جس کی دنیا اس سے الگ ہے۔ پہلی قسم کا انسان ماضی سے متعلق ہے اور دوسری قسم مستقبل کا انسان ہے...... انسانی انا میں ماضی اور مستقبل کی کشمکش جاری رہتی ہے۔ انسان کی روح درحقیقت اس کشمکش کی رزمگاہ ہے۔ نٹشے نے زرتشت کی زبان سے، اس حقیقت کا اعلان کیا تھا، جب اس نے کہا تھا کہ میں ''دیروز و امروز ہوں۔ لیکن مجھ میں کچھ ایسا بھی ہے، جو فرد اور مستقبل سے متعلق ہے۔(۸)

یہی مصنف اپنے استاد G. Gudirjieff کی زبان سے کہتا ہے:

مثلاً آپ رات کو تہیہ کر کے سوتے ہیں کہ میں صبح پانچ بجے اٹھ بیٹھوں گا۔ پانچ بجے آپ کی آنکھ کھل جاتی ہے لیکن بستر سے باہر نکلنے کو آپ کا جی نہیں چاہتا، آپ بدستور لیٹے رہتے ہیں۔

گھنٹے بعد اس وعدہ کے خلاف کام کرتے ہیں، تو کیا آپ کا وعدہ کرنے والا ''میں'' اور وعدہ توڑنے والا ''میں'' ایک ہو سکتے ہیں؟ اسی قسم کی مثالوں کے بعد گورچیف کہتا ہے کہ: یہ سمجھنا بہت بڑی غلطی ہے کہ انسان ہمیشہ وہی رہتا ہے۔ انسان ہمیشہ بدلتا رہتا ہے''[۹] کیا انسان موت کے بعد زندہ رہتا ہے؟ اس پر گورچیف کہتا ہے:

> اگر انسان ہر آن بدلتا رہے۔ اگر اس میں کوئی ایسی شئے نہ ہو جو خارجی تغیرات سے متاثر نہ ہو تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ اس میں کوئی ایسی چیز نہیں جو موت کا مقابلہ کر سکے۔ اگر وہ خارجی اثرات سے آزاد ہو جائے، اگر اس میں اس شئے کی نمود ہو جائے جو اپنی زندگی جئے تو یہ ''شئے'' کبھی مر نہیں سکتی۔ عام حالات میں ہر ہر ثانیہ مرتے رہتے ہیں۔ خارجی حالات بدلتے ہیں اور ان کے ساتھ ہم بھی بدل جاتے ہیں۔ یعنی اس طرح ہمارے بہت سے انا (IS) فنا ہو جاتے ہیں۔ لیکن اگر انسان اپنے اندر مستقل انا کو نشوونما دے لے تو یہ خارجی تغیرات سے غیر متاثر رہ سکتا ہے اور اس طرح طبیعی جسم کی موت کے بعد بھی زندہ رہ سکتا ہے۔[۱۰] انسان کی ذات جس کی تعبیر (Self) سے کی جاتی ہے۔ یہی ذات جب پختہ ہو جاتی ہے تو اسے شخصیت (Personality) کا نام دیا جاتا ہے۔[۱۱]

وہ راشڈیل کی ہمنوائی میں کہتا ہے:

> اخلاقی نظام کا دارومدار ہی اسی سلسلہ پر ہے کہ ''میں'' اپنے تمام گزشتہ فیصلوں اور معاہدوں کا ذمہ دار ہوں۔ اس لیے اگر کچھ عرصہ بعد ''میں'' وہ نہیں رہتا جو پہلے تھا تو اس صورت میں اپنے سابقہ فیصلوں اور معاہدوں کا ذمہ دار ہی قرار نہیں پاتا اور ان فیصلوں کی خلاف ورزی اور ان معاہدوں کی شکست کا الزام مجھ پر کیسے عائد ہو سکتا ہے''۔[۱۲]

ان آراء کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ فکر جدید میں انسان کو ثبات (Permanance) اور تغیر (Change) کا مجموعہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ انسان کی ماہیت پر گفتگو کرتے ہوئے (Berdyaeu) کہتا ہے:

> دنیا میں جس قدر تغیرات رونما ہوتے ہیں ان کے متعلق انسان کا نقطہ نظر دہرا ہونا

تصور ناممکن ہے۔ لہذا ذات کے نشوونما میں انسان کو خود اپنی ذات سے فریب دہی نہیں کرنی چاہیے۔ یعنی اسے اس مستقل شئے کو کبھی نظرانداز نہیں کرنا چاہیے جو اسے ابدی طور پر ملی ہے۔ زندگی میں یہ چیز نہایت ضروری ہے کہ تغیرات کے اس پیہم علم میں جس سے جدت نمودار ہوتی ہے، استقلال ذات کے ساتھ امتزاج کیا جائے''۔[۱۳]

انسان کی مجموعی شخصیت کا مطالعہ ہی مفید ہو سکتا ہے اسی لیے جوڈ (C. E. M. Joad) کہتا ہے:

انسان کے متعلق صحیح علم، س کے مختلف شعبہ ہائے زندگی کے مطالعہ کے مجموعہ کا نام نہیں، انسان کے متعلق صحیح علم اس صورت میں حاصل ہو سکتا ہے کہ انسان کا بہ تمام و کمال مطالعہ کیا جائے۔ بہ تمام و کمال مطالعہ اس کی ذات کے مطالعہ کا نام ہے، اس لیے کہ انسانی ذات ہی کو مکمل انسان کہا جا سکتا ہے۔ اگرچہ انسان کے مختلف حصے اسی ذات کے اجزاء ہوتے ہیں لیکن اس کی ذات ان اجزاء کے مجموعہ سے کچھ زیادہ ہوتی ہے۔ انسانی ذات کا مطالعہ سائنس کی رو سے نہیں کیا جا سکتا''۔[۱۴]

اقبال اس فرق کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

''خدا کی تمام مخلوق میں انسان ہی اس قابل ہے کہ وہ شعوری طور پر اپنے خالق کی حیات تخلیقی میں شرکت کر سکے اس میں یہ جوہر ودیعت کیا گیا ہے کہ یہ ایک بہتر دنیا کا تصور کر سکے اور جو کچھ موجود ہے اسے وہ کچھ بنا دے جو اسے ہونا چاہیے۔[۱۵]

مذہبی کاوشیں

چونکہ مذہب کے پیش نظر ہمیشہ انسان کا روحانی پہلو رہا ہے اس لیے مذہبی گروہ نے انسان کو روحانی اعتبار سے بلند دیکھنے کی آرزو کی ہے۔ بعض مذہبی گروہوں نے اس بات کو بنیادی اصول کی حیثیت سے تسلیم کیا ہے کہ انسان بڑی گھٹیا مخلوق ہے اور بہت سی آلائشوں میں ملوث ہے۔ اسے بلند مرتبہ حاصل کرنے کے لیے غیرمعمولی تگ و دو کرنی چاہیے اور روحانی مراتب کے حصول کو یقینی بنانے کے لیے اسے فطری آلائشوں سے نجات حاصل کرنا ہوگی۔ دنیا اور دنیا کا تعلق انسانی شخصیت کو مسخ کرتا ہے۔ لہذا اس سے کنارہ کشی کی زندگی اختیار کرنی چاہیے۔ ترک دنیا اعلیٰ ترین انسانی مرتبہ حاصل

وجہ سے انسان ہر وقت گناہ کی حالت میں رہتا ہے اور اس سے نکلنے کے لیے عمل کی نہیں فضل خداوندی کی ضرورت ہے اور وہ صرف اس صورت میں حاصل ہو سکتی ہے جب کوئی شخص مسیحؑ کے نا پر بپتسمہ لے گا۔ اس اصطباغ کے ذریعہ سے وہ نئی زندگی حاصل کرے گا اور اصطباغ کے بعد و ہمیشہ فضل خداوندی کا محتاج رہے گا۔ فضل خداوندی کی یہ دائمی اعانت صرف کیتھولک کلیسا کے حوالے سے ہی حاصل کی جا سکتی ہے۔ نجات کے اس تصور کے لیے کفارہ کا عقیدہ اختیار کیا گیا۔ اگرچہ بائبل میں اس عقیدے کی کوئی بنیادی نہیں تاہم پچھلے ڈیڑھ ہزار سال سے اسے عیسائیت کے بنیادی عقیدہ کی حیثیت حاصل ہے۔ اس عقیدہ کی بنیاد پال (Paul) کے بعض بیانات ہیں۔ وہ رومیوں کے نام ایک خط میں لکھتا ہے:

> پس جس طرح ایک آدمی کے سبب سے گناہ دنیا میں آیا اور گناہ کے سبب سے موت آئی اور یوں موت سب آدمیوں میں پھیل گئی اس لیے کہ سب نے گناہ کیا، کیونکہ شریعت کے دیئے جانے تک دنیا میں گناہ تو تھا مگر جہاں شریعت نہیں وہاں گناہ محسوب نہیں ہوتا تو بھی آدم سے لے کر موسیٰ تک موت نے ان پر بادشاہی کی جنہوں نے اس آدم کی طرح جو آنے والے کا مثیل تھا گناہ نہ کیا تھا...... جب ایک شخص کے گناہ کے سبب سے موت نے اس ایک کے ذریعہ سے بادشاہی کی تو جو لوگ فضل اور راستبازی کی بخشش افراط سے حاصل کرتے ہیں۔ وہ ایک شخص یعنی یسوع مسیح کے وسیلہ سے ہمیشہ کی زندگی میں ضرور ہی بادشاہی کریں گے۔ غرض جیسا ایک گناہ کے سبب وہ فیصلہ ہوا جس کا نتیجہ سب آدمیوں کی سزا کا حکم تھا ویسا ہی راستبازی کے ایک کام کے وسیلہ سے سب آدمیوں کو وہ نعمت ملی جس سے راستباز ٹھہر کر زندگی پائیں۔[۱۶]

عیسائی عقیدہ کے مطابق چونکہ اللہ تعالیٰ عادل بھی ہے اور رحیم بھی اسی لیے اس نے انسانوں گناہوں کے اثرات سے نجات دینے کے لیے خود اپنے بیٹے کو چنا اور اس کو انسانی جسم میں دنیا اندر بھیجا۔ اس نے یہ قربانی پیش کی کہ خود سولی پر چڑھ گیا اور اس کی موت تمام انسانوں کی طرف سے کفارہ ہوگئی اور اس کی وجہ سے تمام انسانوں کا نہ صرف اصلی گناہ معاف ہوگیا بلکہ انہوں اصل گناہ کے سبب جتنے گناہ کیے تھے وہ سبھی معاف ہوگئے۔[۱۷] گناہ کا یہی تصور اور اس سے نجا کا یہی غیر منطقی عقیدہ ہے جس نے مغرب کے فکری نظام کو افراط و تفریط کا شکار کیا اور اسے اعتد

ہر چیز فانی ہے اور غیر حقیقی ہے۔ مہاتما بدھ کے نزدیک نئے جیون کی آرزو انسان کو جیون پر آمادہ رکھتی ہے۔ آرزو مصیبت کا سبب ہے حتیٰ کہ موت اور فنا کی آرزو بھی زندگی کی آرزو کی طرح ہے۔ آرزو سے کنارہ کشی آرزو کو ختم کرنا، رد کرنا اور ترک کر دینا ہی مصائب و آلام سے نجات حاصل کرنا ہے۔ لہذا دنیا سے کنارہ کشی اور اشیاء کائنات سے بے رغبتی ہی عین انسانیت ہے۔ بدھ مت میں نجات کا مطلب مکمل فنا ہے۔ یعنی خواہشات کی نفی۔ مذہبی نقطہ نظر سے انسان اپنے گناہوں اور بلائشوں سے اسی صورت نجات حاصل کر سکتا ہے جب اپنے آپ کو سخت تکلیفوں میں مبتلا کر دے۔ مذہب کے اس تصور میں ایک خدا یا کئی خداؤں کی خوشنودی کے لیے چند انسان ریاضت کرتے ہیں اور اپنے آپ کو پاکیزہ بناتے ہیں۔ اس طرح طبقاتی تقدس کا ایک نظام جنم لیتا ہے۔ عام انسان اس تقدس کی بھینٹ چڑھ جاتے ہیں۔ مذہبی طبقات خدا کی نمائندگی میں خلق خدا کی تذلیل کرتے ہیں، انہیں محکوم بناتے ہیں اور ان کے وسائل پر داد عیش دیتے ہیں۔

انسانی زندگی کی یہ طویل داستان دردناک بھی ہے اور عبرتناک بھی۔ مذہب کے نام پر انسان سے جو سلوک ہوا اور مقدس مذہبی گروہ کے ہاتھوں انسانیت کی جس قدر تذلیل ہوئی۔ وہ ناقابل بیان ہے۔ انسان ہی عابد ہے اور انسان ہی معبود؟ بات اگر یہیں ختم ہو جاتی تو بھی خیر تھی۔ مذہبی طبقے نے تو انسانیت پر یہ ظلم بھی کیا کہ اسے پتھروں، حیوانوں، درختوں، پانی، آگ اور دیگر مظاہر فطرت کے سامنے جھکا دیا۔ پتھر کی مورتیوں، اینٹ اور سیمنٹ کے مشاہد اور لکڑی گتے کے بنے ہوئے مواد کے سامنے سجدہ ریز کرانا مذہبی ناخداؤں کے کارہائے نمایاں ہیں۔ اگر بغور دیکھیں تو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے مذہبی نقطہ نظر سے بھی انسان کا مقام متعین نہ ہو سکا۔ اگر ایک طرف روحانی پیشوا کی پرشکوہ شخصیت کو دیکھ کر انسان کی عظمت کا احساس ہوتا ہے تو دوسری طرف جھکتے ہوئے انسانوں کی ذلت آشکار ہوتی ہے، ایک طرف بادشاہ اور صاحب اقتدار انسان اپنی عزت و شان دکھاتے ہیں تو دوسری طرف بھیڑ بکریوں کی طرح بکنے والا غلام اور باندیاں تذلیل کا سامان فراہم کرتے ہیں۔

ہندوؤں کے ہاں خالص معاشرتی سطح پر انسانوں کو ناپاک قرار دیا گیا۔ آریہ قبائل جب ہندوستان میں آئے تو انہوں نے پیدائشی طور پر انسانوں کی چار قسمیں قرار دیں۔ تین کا تعلق آریہ نسل سے تھا اور چوتھی کا مقامی باشندوں سے۔ بظاہر یہ تقسیم کار پر مبنی تصور تھا لیکن بالآخر اس کی

ذات پات کا یہ نظام پوری قوت کے ساتھ قائم ہے۔ شودر ہندو رسم و رواج اور مذہبی عقائد کو قبول کرنے کے باوجود ناپاک ہیں اور ہندو معاشرت میں نچلی سطح پر زندگی گزار رہے ہیں۔ برہمن کے ہاں غیر ہندو بھی ناپاک ہیں۔ اس سے قطع نظر انسان کے بارے میں ہندوؤں کا عمومی رویہ بھی یہ ہے کہ اسے نجات حاصل کرنے کے لیے کئی جیون اختیار کرنے پڑتے ہیں۔ انسانی وجود ناپاک ہے لہذا مرنے کے بعد اسے جلا دینا چاہیے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ہندو مت میں انسان کی تعریف یہ ہے کہ انسان ایک جانور ہے جو قربانی کرتا ہے۔[۱۸] البتہ ان کے ہاں Pantheistic فلسفہ کی وجہ سے انسان کے خدا کا حصہ اور اس کی ذات میں گم ہونے کے امکانات ہیں۔ روح کائنات یا معبود اعلیٰ کے حلول کا عقیدہ انسان کی اعلیٰ ترین حیثیت کا پتہ دیتا ہے۔ لیکن اس کا اطلاق عمومی انسانیت پر نہیں۔ عام انسان کی حیثیت تو ناپاک شئے کی ہے۔ تناسخ ارواح اور وجود کا نئی صورت میں ظاہر ہونا اپنشد کے عہد سے راسخ ہے، اس لیے ہندو مت میں ان تصورات کے بغیر انسان اور اس کی حیات دنیوی کے بارے میں سوچا بھی نہیں جا سکتا۔ بلکہ انسان کی نجات انہی تصورات سے وابستہ ہے۔ کرما کا تصور تناسخ کے پورے عمل پر حاوی لہذا انسان کی نجات اس کا ابتلاء اس کے مصائب اور اس کی پاکیزگی کا ان تصورات سے گہرا تعلق ہے۔

ہم نے انسان کی ابتدا اور اس کی حیثیت کا جائزہ لیا ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ اسے یا تو حیوانی سطح کی مخلوق تصور کیا گیا ہے یا کم از کم ایک غیر ذمہ دار مخلوق جس کے مقصد حیات کو متعین کرنے کے لیے سخت محنت کی ضرورت ہے۔ فلسفہ اور مذہب دونوں نے انسان کے حوالے سے تین اہم سوالات اٹھائے ہیں اور ان کا جواب دینے کی کوشش کی ہے۔ انسانی فکریات میں یہ تینوں سوال بے حد اہمیت کے حامل ہیں اور تینوں فلسفہ و مذہب کے مشترک مسائل ہیں:

۱۔ کائنات کیا ہے؟

۲۔ کائنات کا بنانے والا کون ہے؟

۳۔ انسان کیا ہے؟ اس کائنات سے اس کا کیا رشتہ ہے اور اس کا کائنات بنانے والے سے کیا تعلق ہے؟

فلسفہ و مذہب نے اس حوالے سے گہری علمی بحثیں کی ہیں مذاہب کو خاص طور پر ان مسائل کا

انسان کہاں جاتا ہے؟ اس کے ساتھ کیا ہوتا ہے؟ اس کے اعمال کا اس پر کیا اثر ہوتا ہے؟ کیا انسان اور کائنات کا کوئی خالق ہے اگر ہے تو اس سے انسان اور کائنات کا کیا رشتہ ہے۔ یہ سب بہت اہم سوال ہیں۔ ان سوالات کو اگر مرتب کریں تو مندرجہ بالا تین صورتیں ہی سامنے آتی ہیں:

چونکہ ہمارے موضوع سے متعلق صرف آخری سوال ہے اس لیے ہماری بحث اسی پر مرتکز رہے گی۔ گزشتہ صفحات میں انسان کی حیثیت پر بات ہوئی ہے اس لیے اب ہم اس امر کا مختصر جائزہ لیں گے کہ انسان کا اپنے خالق سے کیا تعلق ہے؟

انسان اور خدا

انسان کی متوازن شخصیت اور معتدل سرگرمیوں کا انحصار اس تعین پر ہے کہ خدا کے ساتھ اس کے تعلق کی نوعیت کیا ہے؟ اور اس سے بھی پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ اس کا تصور خدا کیا ہے؟ کیونکہ اس تعلق کا دارومدار اس تصور پر ہے کہ خدا کیا ہے؟ اور انسان نے خدا کو کیا سمجھا ہے۔ یہ وہ اہم سوال ہے جس کے ساتھ انسان کی تقدیر وابستہ ہے۔ چونکہ خدا ایک غیر مرئی قوت ہے اس لیے اس پر پر اسراریت کا ایک پردہ پڑا ہوا ہے۔ انسان کو اس غیر مرئی وجود کو سمجھنے اور ماننے میں ہمیشہ دشواریاں پیش آتی رہی ہیں۔ مذاہب نے اسے جس طرح متعارف کرایا اور مادی دنیا میں اس کی موجودگی کی جو تعبیرات کی ہیں اس سے یہ مسئلہ اور الجھا ہے۔ وحدت الوجود اور حلول ایک تعبیر ہے اور دیوی دیوتاؤں کا وجود اور ارواح کا تصرف تعبیر کا دوسرا رخ ہے۔ مذاہب نے خدا کو انسان اور انسان کو خدا بنانے کے کئی تجربات کیے ہیں۔ انسانی تاریخ ان تجربات کی شاہد ہے۔ حفیظ نے کہا تھا:

حسن نظر کی آبرو صنعت برہمن میں ہے
جس کو صنم بنا لیا اس کو خدا بنا دیا

خدا کیا ہے؟

مختلف مذاہب میں ذات الٰہی کے متعلق دلچسپ بحثیں ہیں۔ ان کے علم کلام ان بحثوں کا مرقع ہیں۔ اگرچہ یہ بحثیں کنفیوژن کا ذریعہ ہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ مذہب میں کسی نہ کسی انداز میں ایک مافوق الفطرت قوت کا تصور ضرور پایا جاتا ہے۔ مختلف مذہبی رسوم، عبادات، مراقبے، دعائیں، قربانیاں

ہیں۔ مشرکانہ معاشروں میں صاحب اقتدار کے ساتھ پروہت کی شخصیت نمایاں نظر آتی ہے۔ ان مذہبی شخصیات نے حقیقی یا موہوم وسائل کا مفصل نظام مرتب کیا جن سے مافوق الفطرت ہستی یا ہستیوں سے برکات حاصل کی جا سکتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ وسیلہ یہی مذہبی شخصیات ہیں لہذا انہیں نذرانہ پیش کر کے ہی کچھ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ مذاہب کے تصور خدا میں، خدا کے بیٹے بیٹیاں اور چہیتی ہستیاں خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ ان کے تصرف سے یا ان کی سفارش سے انسانی مشکلات حل ہوتی ہیں۔ ان کے ناموں کے استھان بنے۔ ان کے بت تراشے گئے، ان کے مراکز قائم کیے گئے اور ان پر چڑھاوے چڑھائے گئے اور نذرانے پیش کیے گئے۔ مشرکانہ کلچر اور اس کے مذہبی مظاہر کا ایک تسلسل ہے جو پوری انسانی تاریخ پر محیط ہے۔

مغربی مفکرین جنہوں نے سیکولر نقطہ نظر سے خدا کے تصور پر بحث کی ہے ان کے نزدیک اس میں ایک ارتقاء پایا جاتا ہے۔ وہ زمانہ قبل از تاریخ کے انسانی ذہن کے چھلاوے، بھوت، پریت، ارواح خبیثہ، دیوتا اور اس کے بعد خدا کے مختلف تصورات کو اسی سلسلہ کی کڑیاں قرار دیتے ہیں۔ تاہم دور حاضر کے مفکرین نے خدا کی تعریف متعین کرنے کی کوششیں کی ہیں۔ ذیل میں ہم چند تعریفات کو نقل کریں گے:[۱۹]

فرائز (Frise) کے نزدیک ''خدا ہی وہ ہستی ہے جسے مقدس کہا جا سکتا ہے''۔ ولیم جیمز (W. James) کے مطابق ''خدا کائنات کا حصہ اعلیٰ ہے''۔ پروفیسر وائی مین (Weiman) کہتا ہے کہ ''خدا اس ہستی کا نام ہے جو اپنے اندر بلند ترین قدر کا امکان رکھتی ہے''۔ پروفیسر الیگزینڈر (Alexander) کے نظریہ میں کائنات کی اس سطح کا نام جو (Diety) کہلاتی ہے خدا ہے۔[۲۰] پروفیسر ایڈنگٹن (Eddington) کا خیال ہے کہ ''خدا اور کائنات ایک ہی ہیں''[۲۱] ٹیگرٹ (Taggart) کے نزدیک خدا ایک بلند ترین اور خیر کی مظہر ہستی ہے اور وہ ذاتی تشخص رکھتا ہے۔ میتھو آرنلڈ (Mathew Arnold) کہتا ہے کہ خدا اس قوت کا نام ہے جو سب کی مسبب ہے۔

ان تمام تعریفات پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہر شخص نے خدا کی تعریف اپنے فہم اور اپنے تصور کے مطابق کی ہے۔ چونکہ یہ لوگ کائنات کے تصور اور سائنسی فکر کے ذریعہ خدا کی ہستی کو جاننے کی کوشش کرتے ہیں اس لیے یہ تصورات جدا جدا نظر آتے ہیں۔ پروفیسر ہیلڈین (J. S.

کائنات کی مادی تعبیر کے نتیجے میں خدا کو بھی اسی انداز میں سمجھا گیا۔ خدا اور کائنات کو ایک تصور کیا گیا۔ بعض مذاہب میں وحدت الوجود کا تصور تھا اس کی تعبیرات مختلف الفاظ میں سامنے آئی ہیں۔ پروفیسر ایوان (Evan) کہتا ہے:

"خدا اور کائنات دو الگ الگ ہستیاں نہیں ہیں۔ ایک ہی توانائی ہے جو بیک وقت خدا بھی ہے اور کائنات بھی"۔ (۲۳)

ولیم براؤن (Walliam Browne) لکھتا ہے کہ:

اشیائے کائنات میں من حیث المجموع خیر، حسن اور صداقت ہیں۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ سب ایک ہی شئے کے مختلف گوشے ہیں۔ یہ اشیاء تو مجرد ہیں لیکن نفس شئے خود مجرد (Abstract) نہیں یہ بالکل ٹھوس ہے۔ یہ حقیقت کلی ہے۔ یہ کائناتی خدا ہے"۔ (۲۴)

مغربی مصنفین کائنات سے آگے بڑھ کر انسان اور معاشرے کو بھی خدا کہتے ہیں۔ J. H. Homes اپنی کتاب (A Struggling God) میں لکھتا ہے کہ خدا انسان ہے اور انسان خدا۔ دونوں سے مراد وہ زندگی ہے جو محبت کے لیے مصروف کشمکش ہے۔ مفکرین کے ایک گروہ کا خیال ہے کہ خدا نے کائنات کو بنا دیا۔ اب اس کے بعد وہ اس مشینری کے چلانے میں دخل نہیں دیتا۔ یہ مشین انسان کے سپرد کر دی گئی ہے لہذا کائنات میں اب الوہیاتی منصب خود انسان کو مل چکا ہے۔ کامٹ (Auguste comte 1798-1857) اس نظریہ کا موجود تھا۔ اس کا قول تھا کہ "انسانیت خدا ہے" اسی نظریہ کو (Humanism) کہتے ہیں۔ اسی دلیل کو بنیاد بنا کر فیور باخ (Feuerbach) نے خدا کے وجود ہی کا انکار کر دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ خدا صرف انسان کے دل میں ہوتا ہے اس کے باہر اس کا کہیں وجود نہیں۔ ایمز (Edward scribner Ames) کہتا ہے:

خدا کا مخصوص اور قابل رسائی تصور اسی صورت میں پیدا ہو سکتا ہے کہ اسے انسانوں کا وہ اجتماعی ضمیر سمجھ لیا جائے جو معاشرے میں کار فرما اور اس طرح معاشرتی اداروں میں برنگ مجاز جلوہ گر نظر آتا ہے۔ (۲۵)

جان کیرڈ (John Caird) ان نظریات پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتا ہے:

ان نظریات کا جائزہ لیں تو پتہ چلتا ہے کہ جدید مغرب شدید الجھاؤ کا شکار ہے۔ مادہ پرستی کی بنیاد پر انہوں نے خدائے خالق و مالک کا انکار کیا جب مسائل پیدا ہوئے تو سوچنے پر مجبور ہوئے۔ وحی الٰہی کی رہنمائی سے محروم تھے پس منظر میں عیسائیت تھی جو سریت پر زور دیتی تھی۔ یونانی فلسفہ تھا جس میں خدا کے بیرون کائنات (Trenscendence) اور اندرون کائنات (Immenance) کا نزاع موجود تھا۔ پھر کچھ لوگوں نے ہندو فلسفہ اور زرتشتی تصورات کا مطالعہ کیا تھا۔ اس لیے وحدت الوجود اور ثنویت کے تصورات کے زیر اثر وہ بھانت بھانت کی بولیاں بولتے رہے۔ وحی الٰہی کی روشنی سے محرومی کی وجہ سے کسی صحیح رائے پر نہ پہنچ سکے۔ مغرب کے Deismاور Theism کے تصورات کے تحت مغربی معاشرہ خداکے بارے میں بحث کرتا ہے لیکن اس کو انسان کے معاملات سے غیر متعلق سمجھتا ہے۔ مغرب کے مجموعی طور پر انکار خدا کے سبب سے جو مسائل پیدا ہوئے ہیں اس کے نتیجے میں ایک گروہ سریت Mysticam کی طرف راجع ہوا ہے اور نتیجہ وحدت الوجود ہے۔ عظمت انسان کی جو باتیں مغرب میں ہوتی ہیں اور اس کے زیر اثر ہمارے محدود مغربی تعلیم یافتہ کے ہاں پائی جاتی ہیں وہ انسان کی خود مختاری اور خدائی کی باتیں ہیں:

یہ پھول سب اسی دھول سے اُگے ہیں ندیم
میرا خدا میری دنیا کا رہنے والا ہے

ارتقاء کے مفکرین اس بات کے قائل ہیں کہ انسان کی آخری منزل الٰہی صفات کا حصول ہے۔ ان صفات میں سے صفت تخلیق آسان انتخاب ہے عمل تخلیق انسان اور خدا میں قدر مشترک ہے لہٰذا اسی صفت کی تکمیل سے الوہیت سے متصف ہونا ممکن ہو گا۔ برگساں لکھتا ہے:

آج نوع انسان خود اپنی ترقی کے بوجھ کے نیچے دبی کچلی ہوئی مصروف آہ و فغاں ہے۔ یہ اس لیے کہ انسان کو اس کا احساس نہیں کہ اس کا مستقبل خود اس کے ہاتھ میں ہے۔ اس کیلئے سب سے پہلے اس امر کا فیصلہ کرنا ضروری ہے کہ انسان زندہ رہنا چاہتا ہے یا نہیں؟ پھر اس کے بعد یہ کہ انسان محض زندہ ہی رہنا چاہتا ہے یا اس سے آگے بڑھ کر فریضہ کائنات کی تکمیل کے لیے بھی جدو جہد کرنے کو تیار ہے۔ فریضہ کائنات کیا ہے؟ صفات الوہیت رکھنے والی ہستیوں کی تخلیق۔[۲۷]

ممکنات کی دنیا ہے۔ یہ مکمل شدہ جامد و ساکت نہیں۔ اس میں عمل تخلیق جاری رہے گا اور انسانوں کے ہاتھوں جاری رہے گا۔ اسے تمام ممکنات کی پردہ کشائی کرنا ہو گی اور ہر مضمر کو مشہود کر کے دکھانا ہو گا۔ یہ امر تخلیق صرف خدا کی طرف سے انسان کی طرف سے نہیں آتا بلکہ خدا انسان سے تخلیقی جدتوں کا تقاضا کرتاہے اور وہ انسانی آزادی کے کارناموں کا منتظر ہے۔[۲۸] مارٹن بوبر (Martin Buber) کے الفاظ ہیں: ''پھر ہم خود تخلیق میں شریک ہو جاتے ہیں ہم خالق سے جاملتے ہیں۔ اس کے معاون اور رفقاء کی حیثیت سے۔[۲۹]

انسان کی صفت تخلیق اسے خدا کاشریک کار بنا دیتی ہے جس کے لیے اقبال نے ''Coworker'' کی اصطلاح استعمال کی ہے۔[۳۰] اقبال کے پیش نظر شاید انسان کے خدا بننے کا تصور تو نہ ہولیکن وہ انسان کی صفت تخلیق کی بات ضرور کرتے ہیں وہ لکھتے ہیں:

اس ارتقائی تبدیلی کے طریقے میں خدا خود بندہ کا رفیق کار ہو جاتا ہے بشرطیکہ انسان اس میں سبقت اقدام کرے: **اِنَّ اللّٰہ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُ وا مَا بِاَنْفُسِہِمْ**[۳۱] اللہ کسی قوم کو جو حاصل ہے اسے نہیں بدلتا جب تک وہ اپنے حالات نہیں بدلتے۔ لیکن اگر وہ اس بات میں سبقت نہیں کرتا' اگر اپنی ذات کی قوتوں کو بروئے کار نہیں لاتا اگر وہ آگے بڑھنے والی زندگی کی اندرونی خیزش کا احساس نہیں کرتا تو اس کی روح پتھر کی سی قساوت اختیار کر لیتی ہے اور وہ جلد مادہ کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔[۳۲]

Leslie Paul لکھتا ہے:

> انسان اپنی زندگی میں فطری عمل ارتقاء کے خلاف چلتا ہے وہ اس کا انتظار نہیں کرتا کہ حوادث عالم اپنے طریق پر اس کے مقصد کی سمت چلیں۔ نہ ہی وہ زمانہ کا انتظار کرتا ہے کہ وہ اس کے پروگرام کے مطابق چلیں۔ وہ جس چیز کی خواہش کرتا ہے اس کے مطابق اپنا پروگرام مرتب کر لیتا ہے اور پھر عمل تخلیق سے اپنے ماحول پر غلبہ پا کر اسے اپنا ساز گار بنا لیتا ہے .... جو کچھ اس کائنات میں انسان کے ہاتھوں وجود میں آیا ہے' فطرت کا عمل تخلیق و ارتقاء انہیں کروڑوں برس میں بھی پیدا نہیں کر سکتا تھا۔[۳۳]

سکتا ہے لیکن کلی حقیقت شناسی ممکن نہیں ہے۔ قرآن کا یہ جملہ ان پر صادق آتا ہے: **وَيَمُدُّهُمْ فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ**(۳۴) اور انہیں مہلت دیئے جاتا ہے کہ شرارت و سرکشی میں پڑے بہک رہے ہیں۔ بندے اور خدا کے تعلق کے ضمن میں ہم اپنی بات (F. J. Sheen) کے ان الفاظ پر ختم کرتے ہیں۔ وہ لکھتا ہے:

مشرق کی سب سے بڑی غلطی یہ ہے کہ اس نے سمجھ رکھا ہے کہ خدا ہی سب کچھ کرتا ہے اور مغرب کی بڑی غلطی یہ ہے کہ اس نے سمجھ رکھا ہے کہ انسان ہی سب کچھ کرتا ہے۔ مشرق عقیدہ جبر کا قائل ہو چکا ہے اور مغرب میں انانیت پھیل گئی ہے۔(۳۵)

انسان اور کائنات

انسان کی حیثیت کو سمجھنے کے لیے جس طرح انسان اور خدا کے تعلق کا ادراک ضروری ہے اسی طرح انسان اور کائنات کے رشتے کو جاننا ضروری ہے۔ اس تعلق کو سمجھنے کے لیے کائنات کی حقیقت کو جاننا بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے کیونکہ اسی سے تعلق کی نوعیت متعین ہو گی۔

گور جیف کہتا ہے:

> ''یہ ناممکن ہے کہ ہم انسان کا مطالعہ کئے بغیر کائنات کا مطالعہ کر سکیں۔ اس کے ساتھ یہ بھی ناممکن ہے کہ ہم انسان کا مطالعہ کائنات کا مطالعہ کئے بغیر کر سکیں۔ انسان تو کائنات کا عکس ہے۔ اس کی تخلیق انہی قوانین کی رو سے عمل میں آئی ہے جن قوانین کی رو سے کائنات کی تخلیق عمل میں لائی گئی تھی۔ لہٰذا یہ اپنی ذات کے مطالعہ سے کائنات کا مطالعہ کر سکتا ہے۔ یعنی ان تمام قوانین و ضوابط کا مطالعہ جن کے ماتحت اس کارخانہ عالم کا سلسلہ چل رہا ہے۔ اسی کے ساتھ ہی یہ کائنات اور اس کے قوانین کا مطالعہ کرنے سے ان قوانین کا مطالعہ کرے گا جن کے تابع اس کی اپنی زندگی بسر ہونی چاہیئے ....
> اس لیے مطالعہ فطرت اور مطالعہ ذات' متوازی طریق پر ساتھ ساتھ ہوتا جائے تاکہ ایک دوسرے سے مدد لے سکے۔''(۳۶)

اوپنسکی کہتا ہے:

کو جذب کر لینے کا پیہم سلسلہ، طاقتور کا کمزور کو نگل جانے کا سلسلۂ ارتقاء اور تنزل کا سلسلۂ بڑھنے، پھولنے پھیلنے اور مر جانے کا سلسلۂ غرضیکہ انسان کے اندر جمادات سے لے کر خدا تک سب کچھ موجود ہوتا ہے''۔ (۳۷)

Berdyaeu کہتا ہے:

یہ دنیا ممکنات کی دنیا ہے۔ یہ مکمل شدہ جامد و ساکت نہیں۔ اس میں امر تخلیق جاری رہے گا اور انسانوں کے ہاتھوں جاری رہے گا۔ اسے تمام ممکنات سے پردہ کشائی کرنی ہو گی اور ہر مخفی کو مشہود کرکے دکھانا ہو گا۔ یہ امر تخلیق صرف خدا کی طرف سے نہیں آتا بلکہ خدا انسان سے تخلیقی جدتوں کا تقاضا کرتا ہے۔ وہ انسانی آزادی کے کار ناموں کا منتظر رہتا ہے۔ (۳۸)

انسان اور کائنات کے تعلق کا تعین دونوں کے تصورات اور حیثیتوں سے ہو گا۔ انسان کے بارے میں ہم نے مختلف تصورات کا جائزہ لیا ہے، مناسب ہو گا اگر کائنات کے بارے میں ایک مختصر سا جائزہ لے لیا جائے کہ کائنات کیا ہے؟ اس کی ابتداء و انتہا کیا ہے؟ اس کے قوانین کی نوعیت کیا ہے؟ اس کے اندر شکست و ریخت ہو رہی ہے یا یہ ارتقاء پذیر ہے؟ کائنات کے اندر انسان کی کیا حیثیت ہے؟ یہ وہ سوالات ہیں جو انسان کو ہمیشہ پریشان کرتے رہے ہیں اور انسانی رویوں اور عقیدوں کا دارو مدار بھی انہی سوالوں پر ہے۔

مادیین کا ابوالآباء دیمقراطیس (Democritus. B. 470 BC) کہتاہے کہ تمام کائنات ذرات (Atoms) سے بنی ہے۔ جن کی مزید تقسیم ممکن نہیں۔ مسلمان فلسفیوں کی اصطلاح میں اسے جزء لا یتجزی (Indivisible unit) کہا جاتا ہے۔ ہر شئے انہی ذرات سے مرکب ہے ایک دوسرا یونانی فلسفی ہرقلیطس (Heraclitus) کا خیا ل ہے کہ زمانہ (Time) ہی سب کچھ پیدا کرتا ہے اور وہی فنا کرتاہے .... جو چیزیں ہم اس کے ذریعے محسوس کر سکتے ہیں انہی کی قیمت ہے .... یہ دنیا سب کے لیے یکساں ہے۔ نہ کسی آدمی کی بنا ئی ہوئی ہے نہ دیوتاؤں کی یہ ہمیشہ سے تھی اور ہمیشہ رہے گی۔ (۳۹)

کہ کائنات معمّوں میں سمٹ کر آ جاتی ہے۔

(i) ماہیت مادہ اور توانائی (ii) زندگی کا آغاز

(iii) مبدأ حرکت (iv) اشیائے فطرت کا ربط

(v) زبان اور فکر کی بنیاد (vi) مبدأ شعور

(vii) انسانی اختیار کا مسئلہ

ہیکل کے نزدیک پہلے چھ معمے دو بنیادی اصولوں کے تحت حل ہو جاتے ہیں۔ اول یہ کہ ''مادہ اور توانائی غیر متبدل ہیں اور دوسرے یہ کہ کائنات میں عمل ارتقاء جاری ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ غیر شعور اور غیر ذی حیات مادہ سے ارتقائی طور پر زندگی اور شعور پیدا ہو جاتے ہیں۔ باقی رہا ساتواں معمہ یعنی انسانی اختیار و ارادہ کا مسئلہ تو یہ سوال ایسا نہیں کہ اسے کسی سائنٹیفک تحقیق کا موضوع بنایا جائے کیونکہ اس کی بنیاد ایک عقیدہ پر ہے جو وہم کا پیدا کردہ ہے۔ اس کا حقیقی وجود ہی نہیں۔[۴۰] اس نقطہ نظر سے دنیا میں جو کچھ ظہور پذیر ہوتا ہے وہ کسی آزاد روحانی یا نفسی قوت کے ارادہ کے ماتحت وقوع پذیر نہیں ہوتا' بلکہ قوائے فطرت کے امتزاج کا نتیجہ ہوتا ہے۔ کائنات میں جو کچھ موجود ہے وہ انہی اصول کے اعتبار سے مادہ ہی ہے۔ اس کے ماوراء کچھ نہیں۔ میکانکی تصور کائنات کی رو سے کائنات کا کوئی خالق ہے اور نہ ہی اس کی تخلیق سے کچھ مقصد ہے۔ لیکن دور جدید کا سائنس دان مختلف انداز میں سوچتا ہے۔ میکانکی تصور کے مطابق کائنات مختلف عناصر کا ڈھیر سمجھا جاتا ہے اور اس میں کسی قسم کی مقصدیت کا تصور نا قابل قبول تھا۔ لیکن جدید تحقیقات نے نئی راہ اختیار کی ہے۔ ڈریش (Han Driesh) اس موضوع پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ یہ نظریہ کہ تمام کائنات ایک منظّم وحدت ہے وحدت نظم جسے (Monism of order) کی اصطلاح سے تعبیر کیا جانا چاہیے۔ وہ مزید لکھتا ہے کہ وحدت نظم کا یہ تصور نظم کائنات کے متعلق دیگر تمام تصورات کو منسوخ کر دیتا ہے۔ اس کی رو سے کائنات میں الگ الگ نظام کہیں باقی نہیں رہتے۔ بلکہ تمام کائنات وحدت نظم کا مظہر بن جاتی ہے۔ اس وحدت نظم کے پیش نظر ''قوانین فطرت'' کے تصور میں بھی تبدیلی کرنا پڑے گی۔

انسان کے لیے ممکن ہے۔[۴۱] مانچسٹر یونیورسٹی کے پروفیسر جونز (F. W. Jones) کائنات میں وحدت نظم کی موجودگی اور سوچی سمجھی تدبیر (Plan) کی کار فرمائی پر بحث کرتاہے۔ وہ تھامس ڈوائٹ (Thomas Dwight) کے حوالہ سے لکھتا ہے:''اگر اس بات کو بغرض محال تسلیم بھی کر لیا جائے کہ اس قسم کا حیرت انگیز منظّم پلان (Plan) محض اتفاق کی پیدا وار ہے تو بھی اس قسم کے بے شمار منظّم (Plans) کا اس طرح موجود ہونا اس مفروضہ کو مہمل قرار دیتا ہے۔ ہم ذی حیات اور غیر ذی حیات' دونوں میں حیرت انگیز نظم دیکھتے ہیں۔ جوں جوں ہم عناصر اور ان کے مرکبات سے متعلق قوانین کا مطالعہ کرتے ہیں یہ حقیقت اور بھی واضح ہو جاتی ہے کہ ساری کائنات میں ایک ہی قانون نافذ العمل ہے''۔[۴۲]

جدید تحقیقات نے سائنسی علوم کے ماہرین کو اس پر آمادہ کیا ہے کہ وہ کائنات کے اندر ایک نظم کو تسلیم کریں۔ اسی طرح وہ اس رائے کا بھی اظہار کر رہے ہیں کہ کائنات ایک مقصد کے تحت پیدا کی گئی ہے اور اس مقصد کی طرف رواں دواں ہے۔ انسان بھی اس کائنات کا جزو ہے اسی لیے یہ بھی سلسلۂ کائنات کے ساتھ اس منزل کی طرف کشاں کشاں جا رہا ہے۔ پروفیسر جونز (F. W. Jones) اپنی کتاب کے آخر میں لکھتا ہے:

> اگر انسان نے اپنے فکر میں یہ تبدیلی پیدا کر لی کہ انسانی زندگی بے مقصد نہیں تو اس سے نوع انسان کو بے حد فائدہ پہنچے گا۔ انسانی زندگی کو با مقصد تسلیم کرنے سے یہ بھی تسلیم کیا جائے کہ تمام ذی حیات اشیاء اور غیر ذی حیات اشیاء غرضیکہ پوری کائنات با مقصد ہے۔ ایسا ہو سکتا ہے کہ ایک انسان شاہراہ حیات پر اس طرح گامزن ہو کہ اسے نظر آئے کہ اس کے ساتھ تمام سلسلہ کائنات اسی منزل کی طرف جا رہا ہے جو اس کا منتہائے نگاہ ہے اور یہ اس کاروان کا ایک راہ رو ہے........ تاریخ کے جس دور سے ہم گذر رہے ہیں اس میں یہ احساس بھی ضروری ہو گیا ہے کہ کائنات کا یہ عظیم سلسلہ ایک مقصد کا ثبوت پیش کر رہا ہے اور ہر انسانی زندگی خواہ وہ اس قدر غیر اہم کیوں نہ ہو اس کائناتی مقصد کا جزو ہے۔[۴۳]

مذہبی نقطۂ نظر

ہے اور وہ کائنات کے خالق کا تصور ہے۔ مذہب کا نقطہ نظر یہ ہے کہ کائنات اور کائنات کے اندر موجود ہر شئے مخلوق ہے اور اس کا ایک خالق ہے۔

ہندو تصور

ہندوؤں کا نظریہ یہ ہے کہ کائنات مخلوق ہے اور کنٹرول کر نے والی کئی قوتیں کام کر رہی ہیں۔ ہندوؤں کے اساطیری ادب میں آسمانوں کے خدا اور زیریں دنیا کے خدا' روشنی کی قوتیں اور تاریکی کی قوتیں' نظم کی قوتیں اور بد نظمی اور تباہی کی قوتیں موجود ہیں۔ اسی طرح حرکت اور طاقت کی قوتیں ان کے تصور کائنات میں اہمیت رکھتی ہیں۔ ان قوتوں کے باہمی تصادم کی وجہ سے انسان کے لیے مشکلات پیدا ہوتی ہیں۔ آسمانی خداؤں کو دیوا اور زیریں دنیا کے خداؤں کو اسورا کہا جاتا ہے۔ البتہ ویدک دور کے بعد تین خداؤں کی حیثیت مسلم ہو گئی۔ براہما' وشنو اور شیوا۔ ہندو مت نے انہی تینوں کو نظم کائنات کے حوالے سے اہمیت دی۔ براہما جو خالق کائنات ہے وشنو اس کا انتظام کرتا ہے اور سنبھالتا بھی ہے اور شیوا تباہی کا دیوتا ہے۔

کائنات کا نظام دورانیہ پر چلتا ہے موسموں کے تغیر و تبدل کے ساتھ پیدا وار اور زندگی کی خوشگواری وابستہ ہے۔ ہندوؤں نے ہرنفع بخش شئے کو خدائی حیثیت دے رکھی ہے۔ سورج' آگ پانی حتی کہ نفع و ضرررساں جانور بھی خدائی فیض کا منبع ہیں۔ مشرکانہ رسوم اور وجودی فلسفہ کی بنا پر ہندوؤں کے ہاں انسان اور کائنات کے درمیان ایک دلچسپ تعلق قائم ہے۔ ویدک مصنف کائنات کو تخلیق در تخلیق اور قربانی کا عمل قرار دیتے ہیں۔ ان کے ہاں یہ تصور بھی ہے کہ کائنات کسی بڑے منتظم کا کارخانہ ہے جس نے آسمان و زمین کو الگ کیا۔ سیارے اور ستارے مزین کئے اور زمین پر درخت پیدا کئے یہ کسی بڑے صانع کا کارنامہ ہے۔ کائنات کی تخلیق میں صرف ایک ہستی کی کار فرمائی ہے یا بہت سی ہستیوں کی تدبیر شامل ہے، اس کے بارے میں ہندوؤں کے متضاد نظریات موجود ہیں۔ ایک خالق کا تصور بھی ہے اور وجودی نقطہ نظر سے کائنات اسی ہستی کا حصہ تھی جسے اس نے الگ کیا اور پھر اسی کے ساتھ مل جائے گی۔

ہم رگ وید[۴۴] میں پڑھتے ہیں کہ ابتدا میں ایک ذات کے سوا کچھ موجود نہ تھا۔ اگر خدا ہی وہ منفرد ذات ہے تو پھر اس کے ساتھ کوئی Primordial وجود نہیں ہو سکتا۔ لیکن آغاز کائنات کے

ہے یا خدا کائنات کا حصہ ہے۔ خدا کائنات سے الگ ہے مگر بالکل الگ نہیں۔ ویدانتی فلسفہ کے تحت خدا اور کائنات کے الگ تشخص کی بات خاصی الجھی ہوئی ہے۔ چونکہ انسان کائنات کا حصہ ہے اس لیے خدا کے ساتھ اس کے تعلق کی نوعیت بھی کائنات جیسی ہے۔شنکر (Shankara 788 - 820) کے مطابق کائنات اور براہما ایک ہیں جبکہ مدھوا (Madhva 1199-1278) کے نزدیک براہما اور عالم مکمل طور پر جدا ہیں۔ ایک تیسری صورت بھی ہے کہ براہما اور عالم تنوع کے ہوتے ہوئے ایک ہیں۔ یہ رائے رامانوجا (Ramanuja 1056-1137) کی ہے۔ یہ شخص مدھوا کی طرح اپنشد پر مبنی فلسفہ وایدانت کا منکر نہیں ہے لیکن اس کی تعبیر شنکر سے مختلف ہے۔ اس کے نزدیک یہ دنیا محض فریب نظر نہیں بلکہ حقیقت ہے۔

بدھ مت کا تصور

بدھ مت خدا کے مسئلے کو زیر بحث نہیں لاتا لہٰذا کائنات کی تخلیق یا ظہور کے تصورات غیر متعلق ہیں۔ البتہ انسان اور کائنات کے تعلق کے حوالے سے بدھ مت واضح تصور رکھتا ہے۔ بدھ مت کا رویہ سری نوعیت کا ہے دنیا 'دکھوں کا گھر ہے لہٰذا انسان کو نروان اور تنویر حاصل کرنے کے لیے علائق دنیا چھوڑ دینا چاہیے۔ دنیا سے کنارہ کشی ہی روحانی ارتقاء کا ذریعہ ہے۔

یہودی و عیسائی تصور

یہودیت اور عیسائیت کا کلاسیکل نقطہ نظر بائبل کی نصوص پر مبنی ہے جس کا بیان (Genesis) میں ہے لیکن عیسائی علم کلام نے نئی جہتوں کو بیان کیا ہے۔ (Hans kung) نے ہندو تصور پر بحث کرتے ہوئے عیسائی نقطہ نظر کو مرتب انداز میں بیان کیا ہے وہ لکھتا ہے:

It is a theological formula for the belief that the world and humanity, space and time, have no other cause but God for their existence and since God is the origin of each and every thing, faces no competition from an evil or demonic counter principle (as he would in mazdaism or manachaism). According to the biblical account, the world in general and in particular, including matter, the human body and sexuality is fundamentally good.[۴۵]

that the creator does not remain outside his work. Instead, creation can be understood as God's unfolding in the World, without the world dissolving into God or God into the world, without the world surrendering its autonomy or God vanishing into the world thus we could have creation as a process of unfolding God or God unfolding through creation. No being would be made into God, but neither it exists out side God.(۴۶)

God is to be thought of omnipresent, ineffable mystery of this world, a mystry that embraces the origin if its being, its becoming, its order, and to good, such that man and the world are neither independent of God nor a mere illusion, but a relative reality. Neither undifferentiated identity of God and the individual soul, nor a permanent out distinction between them, but the difference dialectically "Sublated" in identity.(۴۷)

انسان نے ہمیشہ اپنے آپ کو اس کائنات کا حصہ سمجھا ہے اور اس کے اندر اور اس کے ساتھ رہ کر اپنی حیاتیاتی اور روحانی آرزوؤں کی تکمیل کی ہے۔ گردو پیش کے ہیبت ناک نظاروں نے اسے توہمات کی دنیا میں لا کھڑا کیا اور وہ اشیاء کائنات کے ساتھ ساز گاری کے عمل میں ان میں خدائی قدرت کے آثار تلاش کرنے لگا۔ اس طرح اس نے مظاہر فطرت کی پرستش شروع کی اور دیوی دیوتاؤں کی صناعت سے وہ استمداد و استعانت کے اسلوب وضع کرنے لگا۔ ان تمام توہماتی سرگرمیوں کے باوجود قدیم فکر کی اساس انسان اور کائنات کی ساز گاری پر ہے۔ اور یہ ساز گاری بھی رفتہ رفتہ پیدا ہوئی ورنہ ابتداء میں تو وہ خارجی قوتوں کے سامنے یکسر بے بس و لاچار تھا۔ بادل کی گرج، بجلی کی چمک، بارش کی تباہ کاریاں، دریاؤں کی طغیانیاں، سمندر کی موجیں، پہاڑوں کی آتش فشانیاں، زمین کی زلزلہ خیزیاں، حادثات اور بیماریاں اور بالآخر موت وہ بے پناہ قوتیں تھیں جن کا اس کے پاس کوئی علاج نہ تھا۔ وہ ان سے ڈرتا، کانپتا اور لرزتا تھا اس لیے ان کے سامنے گڑ گڑاتا اور جھکتا تھا۔ انہیں

انسان کے مفاد میں ہے۔ دور حاضر کی سائنس نے تجربات و اکتشافات کے حیرت انگیز کرشمے دکھائے ہیں۔ بحر و بر اور فضا و آسمان کے چھپے گوشوں تک رسائی حاصل کرنے کی کوششوں کے ساتھ حقائق اشیاء کو جاننے کی انسانی کاوشوں نے نئے زاویے منکشف کئے ہیں۔ تسخیر کائنات کے فلسفے نے انسان کو وسائل کائنات کے استحصال کا زبر دست موقعہ دیا ہے۔ لیکن اس استحصال کا نتیجہ ماحول کا عدم توازن ہے۔ کائناتی حرارت (Global warming)اور فطری توازن (Echo system) کی تباہی انسانیت کے لیے نئے مسائل پیدا کر رہی ہے۔ قدیم فکر کا اشیاء کائنات کی پرستش کا تصور اور دور جدید کا تصورتسخیر دونوں غیر متوازن ہیں' دونوں سے انسان کو مجموعی طور پر نقصان پہنچا ہے۔ انسا ن نے اپنے تجربات و مشاہدات کی بنیاد پر زنجیر حقائق عالم کو سمجھنے کی کوشش کی۔ بعض مشاہدات و اکتشافات کی وجہ سے سائنسدانوں کو یہ احساس ہوا کہ وہ صرف کائنات کا ایک صحیح تصور پیش کر سکیں گے لیکن اپنی پہلی بڑی بڑی امیدوں کے با وجود سائنس دان کچھ عرصہ سے اس بات پر متفق ہو گئے ہیں کہ وہ قیامت تک بھی قوانین کائنات کی زنجیر کی ساری کڑیوں کو دریافت نہیں کر سکیں گے۔(۴۸)
اس تسخیر سے اس کی مادی قوت میں اضافہ ہوا ہے لیکن اقبال کے بقول:

وہ فکر گستاخ جس نے عریاں کیا ہے فطرت کی طاقتوں کو
اسی کی بے تاب بجلیوں سے خطر میں ہے اس کا آشیانہ

میسن (J. W. T. Mason) لکھتا ہے:

''اگر انسان نے اپنے اندر کردار' عزم اور ایسی قوت پیدا نہیں کی جو مادی ترغیبات کا مقابلہ کر سکے' تو مادہ پر جس قدر قوت انسان کو حاصل ہوتی جائے گی اسی قدر اس کا اندیشہ زیادہ ہو گا کہ یہ مادی قوت اسے تباہ کر دے گی''(۴۹)

انسان اور انسان

ارسطو سے لے کر ابن خلدون تک ہر شخص کا کہنا ہے کہ انسان ایک معاشرتی حیوان ہے۔ اسے اپنے ہم جنس کے ساتھ رہنا ہے۔ لیکن انسانی تاریخ اس کے بھیانک مظالم سے بھری پڑی ہے۔ اگرچہ بعض جنگلی قبائل میں انسان خوری کی مثالیں پائی گئی ہیں لیکن بحیثیت مجموعی انسان خوری اس کی عادت نہیں بن سکی۔ انسانی تعلق کی قدیم ترین مثال تو ہندوؤں کی ہے جنہوں نے ذات پات کا ایک

امتیازی اور ظالمانہ سلوک کو قائم رکھا ہے اور ہندو مت پر لکھنے والے مصنفین ہندوؤں سے زیادہ اس کی توجیہات پیش کرتے ہیں:

Ever since the middle of the first millennium B. C. There have been loud and repeated demands that people should be judged not by their social origin, but by their qualities. This ideal was tried out by a number of religious communities but over the course of time, most of them went back to achnowledging the cast or cast like structure.(۵۰)

مختلف مذاہب اورمعاشروں میں انسان کی غلامی اور ا س کی خرید و فروخت ایک مسلمہ اصول کی حیثیت سے رہی۔ نسلی امتیاز اور گروہی تفوق بھی اب تک ایک تصور اور عقیدے کے طور پر موجود ہے۔ انسان کے ہاتھوں انسان کا استحصال ایک تاریخی حقیقت ہے۔ ہندوؤں کے علاوہ جس تحریک اور تصور نے امتیازات کی صورتوں کو مستحکم کیا وہ عصر حاضر کا نیشنلزم ہے جس نے قوموں کو غلام اور تشدد کا نشانہ بنایا۔ انسان اور انسان کے تعلق کو دور حاضر کے جس تصور نے تباہ کیا وہ بقاء اصلح Survival of the fittest کا اصول ہے۔ اس کے مطابق حیاتیات کے دائرے میں جو کشمکش اور تنازع للبقاء ہے اس کا لازی نتیجہ ہے کہ کمزور مٹ جائیں اور طاقتور قائم رہ جائیں۔ اسے فطرت کا اصول بنا کر پیش کیا گیا اور انسانی زندگی کو حیاتیاتی لحاظ سے حیوانی دنیا سے متعلق کیا گیا۔ ڈارون کے نظریہ ارتقاء کے مطابق انسان حیوانیت کی ایک ارتقائی کڑی ہے۔ ڈارون (Darwin 1809 - 1882) نے دعویٰ کیا کہ طبعی قوانین کے زیر اثر دنیا میں حیات نمودار ہوئی۔ حیات نے بالآخر انسان کی شکل میں ظہور کیا ہے جس سے ضمنی نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ یہ کارنامہ بغیر خدا وند تعالیٰ کے چل رہا ہے اس طرح خدا کے وجود اور اس کی خالقیت کا انکار کر دیا گیا۔ انسان کی حیوانیت' خدا کا انکار اور بے مقصد حیات کی وجہ سے عصر حاضر نے انسان کشی کی جو مثالیں قائم کی ہیں اس کی نظیر پوری انسانی تاریخ میں نہیں ملتی۔ پروفیسر سورکن (Sorokin) لکھتے ہیں:

گیارہویں صدی عیسوی سے لے کر انیسویں صدی عیسوی تک تمام جنگوں میں مجموعی طور پر کوئی ڈیڑھ کروڑ آدمی قتل ہوئے اور زخمی ہوئے۔ لیکن دنیا کی پہلی جنگ عظیم میں کوئی دو کروڑ انسان ہلاک

انسانیت کشی کی یہ رسم اب بھی جاری ہے۔ انسان انسان کے خلاف جو کچھ کر رہا ہے اس کے پیچھے مغربی مفکرین کی آراء ہیں۔ روسو کہتا ہے ''انسان ایک وحشی ہے البتہ اس کو سدھایا جا سکتا ہے'' ہابز کے مطابق ایک انسان دوسرے انسان کے لیے بھیڑیا ہے'' ہیوم کے نزدیک انسان کو بدمعاش تصور کیا جانا چاہئیے۔ مسئلہ ارتقاء کے زیر اثر انسان کو نرا حیوان قرار دے کر انسانی زندگی کو بے مقصد حیوانی کشمکش قرار دیا گیا ہے۔ لہٰذا انسان اور انسان کا تعلق رحمت و شفقت کا نہیں بلکہ حیوانی چیر پھاڑ کے قانون پر مبنی ہے جو جنگل کا قانون تو ہو سکتا ہے انسانی معاشرے کا نہیں۔ انسان کے متعلق غلط تصورات کی وجہ سے انسان نے انسان سے جو سلوک کیا ہے وہ خوفناک ہے ۔ انسانی رویہ اور زیادہ ہولناک ہو جاتا ہے جب اسے Institutionalise کرلیا جاتا ہے مثلاً ہندوستان میں صدیوں تک شوہر کی موت کے بعد بیوی کو زندہ رہنے کے حق سے محروم کیا جاتا رہا۔ اس کو شوہر کی لاش کے ساتھ زندہ جلا دیا جاتا تھا۔ ہندوستان ہی میں انسانوں کے ایک طبقہ کو اچھوت قرار دیا گیا اور انہیں انسانیت کے مرتبے سے محروم رکھا گیا۔ یونان میں ارسطو (Aristotal 384-322 B.C) جیسا فلسفی عورتوں اور غلاموں کو انسانوں سے فرد تر درجہ دیتا ہے۔ بدھ مت کے زیر اثر ہندوستان میں اور کیتھو لک مذہب کے زیر اثر یورپ میں ازدواجی تعلقات کو گندگی قرار دیا گیا جس سے اجتناب ضروری تھا۔ امریکہ میں ریڈ انڈین (Red Indian) کے ساتھ اور آسٹریلیا میں مقامی باشندوں (Aborignes) کے ساتھ جو کچھ کیا گیا وہ انسانیت کے لیے باعث شرم ہے۔ سفید فام امریکیوں نے ریڈ انڈین کو ان کی زمینوں سے بے دخل کر کے ان پر غاصبانہ قبضہ کر لیا۔ قتل و نہب کے اس پورے عمل میں انہیں داد فریاد سے بھی محروم کر دیا گیا۔ 1830ء میں امریکی صدر انڈریو جیکسن (Andrew Jachson) نے کانگریس سے یہ ظالمانہ قانون پاس کرایا کہ ریڈ انڈین کی گواہی امریکی عدالت میں نا قابل قبول ہے۔ اس قانون کے پاس ہونے کے بعد ان کے تمام مقدمات خارج کر دیئے گئے[۵۲] انسان اور انسان کے تعلق کے بارے میں مختلف مذاہب اور جدید سیکولر فکر نے جو غلط بنیادیں فراہم کی تھیں ان کے نتیجے میں انسانیت کا خون بہتا رہا' اس کی تذلیل ہوتی رہی اور انسان دوسرے انسان کے لیے واقعی بھیڑیا ثابت ہوا۔ رہی سہی کسر جدید سرمایہ دارانہ نظام نے پوری کر دی جس نے انسانی زندگی میں مسابقت کے اصول کو بنیاد قرار دیا۔ اس مسابقت نے کمزوروں کے لیے کوئی گنجائش ہی نہیں چھوڑی۔ جدید سرمایہ دارانہ زبان میں اس مسابقت

قرآن کا تصور انسان

ہم نے قدیم اور جدید فکر کی روشنی میں انسان کی ابتداء اس کی حیثیت' انسان اور انسان اور کائنات اور انسان کے تعلق کا جائزہ لیا ہے جو واضح طور پر غیر متوازن نظر آئے ہیں۔ اسلام نے انسان کے بارے میں غیر متوازن نظریات کے مقابلے میں عظمت انسانی کے بارے میں ایک مثبت اور متوازن نظریہ پیش کیا۔ یہ شرف صرف اسلام ہی کو حاصل ہے کہ اس نے انسانی عظمت کا نظریہ اس وقت پیش کیا جب ان بنیادوں پر سوچنے کا شعور بھی کم ہی تھا۔ گذشتہ صفحات میں جن نکات پر بات کی گئی ہے انہی کے حوالے سے اسلامی نقطہ نظر پیش کیا جائے گا۔

تخلیق انسان

تخلیق انسان کے سلسلے میں اسلام کا موقف تقریباً وہی ہے جو یہودیوں اور عیسائیوں کا ہے یعنی انسان اللہ کی براہ راست تخلیق کردہ مخلوق ہے البتہ قرآن نے جو تفصیلات دی ہیں وہ مختلف ہیں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَلَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ (۵۳)

ہم نے تمہاری تخلیق کی ابتدا کی' پھر تمہاری صورت بنائی پھر فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو۔

سید مودودیؒ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:(۵۴)

اور یہ جو فرمایا کہ ہم نے تمہاری تخلیق کی ابتدا کی' پھر تمہیں صورت بخشی' پھر فرشتوں کو حکم دیا کہ آدمؑ کو سجدہ کرو' اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے پہلے تمہاری تخلیق کا منصوبہ بنایا اور تمہارا مادہ آفرینش تیار کیا' پھر اس مادے کو انسانی صورت عطا کی' پھر جب ایک زندہ ہستی کی حیثیت سے انسان وجود میں آ گیا تو اسے سجدہ کرنے کے لیے فرشتوں کو حکم دیا۔ اس آیت کی یہ تشریح خود قرآن مجید میں دوسرے مقامات پر بیان ہوئی ہے۔ مثلاً سورۃ ص میں ہے۔

اِذْقَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ طِیْنٍ O فَاِذَا سَوَّیْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ

کرنے والا ہوں' پھر جب میں اسے پوری طرح تیار کر لوں اور اس کے اندر اپنی روح سے کچھ پھونک دوں تو سب اس کے آگے سجدہ میں گر جانا۔''

اس آیت میں وہی تین مراتب ایک دوسرے انداز میں بیان کئے گئے ہیں۔ یعنی پہلے مٹی سے ایک بشر کی تخلیق پھر اس کا تسویہ' یعنی اس کی شکل و صورت بنانا اور اس کے اعضاء اور اس کی قوتوں کا تناسب قائم کرنا' پھر اس کے اندر اپنی روح سے کچھ پھونک کر آدمؑ کو وجود میں لے آنا۔ اسی مضمون کو سورۂ حجرؔ میں بایں الفاظ ادا کیا گیا ہے:

وَاِذْقَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّی خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍمَّسْنُوْنٍ O فَاِذَا سَوَّيْتُه وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْالَه سٰجِدِيْنَ(۵۶)

اور تصور کرو اس وقت کا جب کہ تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا کہ خمیر اٹھی ہوئی مٹی کے گارے سے ایک بشر پیدا کرنے والا ہوں' پھر جب میں اسے پوری طرح تیار کر لوں اور اس کے اندر اپنی روح پھونک دوں تو تم سب اس کے آگے سجدہ میں گر پڑنا۔''

تخلیق انسانی کے اس آغاز کو اس تفصیلی کیفیت کے ساتھ سمجھنا ہمارے لیے مشکل ہے۔ہم اس حقیقت کا پوری طرح ادراک نہیں کر سکتے کہ مواد ارضی سے بشر کس طرح بنایا گیا' پھر اس کی صورت گری اور تعدیل کیسے ہوئی اور اس کے اندر روح پھونکنے کی نوعیت کیا تھی لیکن بہر حال یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ قرآن مجید انسانیت کے آغاز کی کیفیت ان نظریات کے خلاف بیان کرتا ہے جو موجودہ زمانہ میں ڈارون کے متبعین سائنس کے نام سے پیش کرتے ہیں۔ ان نظریات کی رو سے انسان غیر انسانی اور نیم انسانی حالت کے مختلف مدارج سے ترقی کرتا ہوا مرتبہ انسانیت تک پہنچا ہے اور اس تاریخی ارتقاء کے طویل خطہ میں کوئی نقطہ خاص میں ایسا نہیں ہو سکتا جہاں سے غیر انسانی حالت کو ختم قرار دے کر ''نوع انسانی'' کا آغاز تسلیم کیا جائے۔ بخلاف اس کے قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ انسانیت کا آغاز خالص انسانیت ہی سے ہوا ہے' اس کی تاریخ کسی غیر انسانی حالت سے قطعاً کوئی رشتہ نہیں رکھتی وہ اول روز سے انسان ہی بنایا گیا تھا اور خدا نے کامل انسانی شعور کے ساتھ پوری روشنی میں اس کی ارضی زندگی کی ابتدا کی تھی۔

انسانیت کی تاریخ کے متعلق یہ دو مختلف نقطۂ نظر ہیں اور ان سے انسانیت کی دو بالکل مختلف

میں تلاش کریں گے جن کے تحت حیوانی زندگی چل رہی ہے۔ اس کے لیے حیوانات کا سا طرزِ عمل آپ کو بالکل ایک فطری طرزِ عمل معلوم ہو گا۔ زیادہ سے زیادہ جو فرق انسانی طرزِ عمل اور حیوانی طرزِ عمل میں آپ دیکھنا چاہیں گے وہ بس اتنا ہی ہو گا کہ حیوانات جو کچھ آلات اور صنائع اور تمدنی آرائشوں اور تہذیبی نقش و نگار کے بغیر کرتے ہیں انسان وہی سب کچھ ان چیزوں کے ساتھ کرے۔ اس کے برعکس دوسرا تصور اختیار کرتے ہی آپ انسان کو جانور کے بجائے ''انسان'' ہونے کی حیثیت سے دیکھیں گے۔ آپ کی نگاہ میں وہ ''حیوان ناطق'' یا ''متمدن جانور'' نہیں ہو گا بلکہ زمین پر خدا کا خلیفہ ہو گا۔ آپ کے نزدیک وہ چیز جو اسے دوسری مخلوقات سے ممتاز کرتی ہے اس کا نطق یا اس کی اجتماعیت نہ ہو گی بلکہ اس کی اخلاقی ذمہ داری اور اختیارات کی وہ امانت ہو گی جسے خدا نے اس کے سپرد کیا ہے اور جس کی بنا پر وہ خدا کے سامنے جواب دہ ہے۔ اس طرح انسانیت اور اس کے جملہ متعلقات پر آپ کی نظر پہلے زاویہ نظر سے یک سر مختلف ہو جائے گی۔ آپ انسان کے لے ایک دوسرا ہی فلسفہ حیات اور ایک دوسرا ہی نظام اخلاق و تمدن و قانون طلب کرنے لگیں گے اور اس فلسفے اور اس نظام کے اصول و مبادی تلاش کرنے کے لیے آپ کی نگاہ خود بخود عالم اسفل کے بجائے عالم بالا کی طرف اٹھنے لگے گی۔(۵۷)

قرآن نے تخلیق انسان کے بارے مختلف مقامات پر ارشادات ربانی پیش کئے ہیں۔ ان آیات کے مطالعہ سے ایک تصویر ابھرتی ہے جو اسلام کے تصور انسان کو واضح کرتی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍO وَالْجَآنَّ خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِO وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍO فَاِذَا سَوَّیْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِیْنَO(۵۸)

ہم نے انسان کو سڑی ہوئی مٹی کے سوکھے گارے سے بنایا۔ اور اس سے پہلے جنوں کو ہم آگ کے لپٹ سے پیدا کر چکے تھے۔ پھر یاد کرو اس موقع کو جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا کہ ''میں سڑی ہوئی مٹی کے سوکھے گارے سے ایک بشر پیدا کر رہا ہوں۔ جب میں اسے پورا بنا چکوں اور اس میں اپنی روح سے کچھ پھونک دوں تو تم سب اس کے آگے سجدے میں گر جانا۔''

کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ بلکہ اس کی تخلیق ابتداء براہ راست ارضی مادوں سے ہوئی ہے جن کی کیفیت کو اللہ تعالیٰ نے **صلصال من حَمَاٍ مسنون** کے الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔ **حمأ** عربی زبان میں ایسی سیاہ کیچڑ کو کہتے ہیں جس کے اندر بو پیدا ہو چکی ہو' یا بالفاظ دیگر خمیر اٹھ آیا ہو۔ **مسنون** کے دو معنی ہیں۔ ایک معنی ہیں متغیر، منتن اور املس' یعنی ایسی سڑی ہوئی جس میں سڑنے کی وجہ سے چکنائی پیداہو گئی ہو۔ **صلصال** اس سوکھے گارے کو کہتے ہیں جو خشک ہو جانے کے بعد بجنے لگے۔ یہ الفاظ صاف ظاہر کرتے ہیں کہ خمیر اٹھی ہوئی مٹی کا ایک پتلا بنایا گیا تھا جو بننے کے بعد خشک ہوا اور پھر اس کے اندر روح پھونکی گئی۔ سموم گرم ہوا کو کہتے ہیں۔ اور نار کو سموم کی طرف نسبت دینے کی صورت میں اس کے معنی آگ کے بجائے تیز حرارت کے ہو جاتے ہیں۔ اس سے ان مقامات کی تشریح ہو جاتی ہے جہاں قرآن مجید میں یہ فرمایا گیا ہے۔ روح کے لفظ سے معلوم ہوا کہ انسان کے اندر جو روح پھونکی گئی ہے وہ دراصل صفات الٰہی کا ایک عکس یا پر تو ہے حیات' علم' قدرت' ارادہ' اختیار اور دوسری جتنی صفات انسان میں پائی جاتی ہیں' جن کے مجموعہ ہی کا نام روح ہے۔ یہ دراصل اللہ تعالیٰ ہی کی صفات کا ایک ہلکا سا پرتو ہے جو اس کالبد خاکی پر ڈالا گیا ہے اور اسی پرتو کی وجہ سے انسان زمین پر خدا کا خلیفہ اور ملائکہ سمیت تمام موجودات ارضی کا مسجود قرار پایا ہے۔ یوں تو ہر وہ صفت جو مخلوقات میں پائی جاتی ہے۔ اس کا مصدر منبع اللہ تعالیٰ ہی کی کوئی نہ کوئی صفت ہے۔ جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ:

جعل الله الرحمة مِأة جزء فامسك عنده تسعة وتسعين وانزل فى الارض جزء ا واحداً فمن ذلك الجزء تتراحم الخلق حتى ترفع الدابة حافرها عن ولدها خشية ان تصيبه (۵۹)

اللہ تعالیٰ نے رحمت کو سو حصوں میں تقسیم فرمایا' پھر ان میں سے ۹۹ حصے اپنے پاس رکھے اور صرف ایک حصہ زمین میں اتارا۔ یہ اسی ایک حصے کی برکت ہے جس کی وجہ سے مخلوقات آپس میں ایک دوسرے پر رحم کرتے ہیں یہاں تک کہ اگر ایک جانور اپنے بچے پر سے اپنا کھر اٹھاتا ہے تاکہ اسے ضرر نہ پہنچ جائے' تو یہ بھی دراصل اس حصہ رحمت کا اثر ہے''۔ مگر جو چیز انسان کو دوسری مخلوقات پر فضیلت دیتی ہے وہ یہ ہے کہ جس جامعیت کے ساتھ اللہ کی صفات کا پرتو اس پر ڈالا گیا ہے اس سے کوئی دوسری مخلوق سر فراز نہیں کی گئی۔ یہ ایک ایسا باریک مضمون ہے جس کے سمجھنے میں ذرا سی

ایک اور مقام پر تخلیق اانسانی کو دوسرے پیرایہ میں بیان کیا۔ اصل مضمون ایک ہے لیکن یہاں ابتدائی تخلیق کے بعد نسل انسانی کے تسلسل کو بیان کیا۔ فرمایا:

اَلَّذِیْٓ اَحْسَنَ کُلَّ شَیْءٍ خَلَقَهٗ وَبَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِیْنٍO ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِیْنٍO ثُمَّ سَوّٰهُ وَنَفَخَ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَ فْئِدَةَ قَلِیْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ(۶۱)

جو چیز اس نے بنائی خوب ہی بنائی۔ اس نے انسان کی تخلیق کی ابتدا گارے سے کی پھر اس کی نسل ایک ایسے ست سے چلائی جو حقیر پانی کی طرح کا ہے۔ پھر اس کو نِک سُک سے درست کیا اور اس کے اندر اپنی روح پھونک دی۔ اور تم کو کان دیئے' آنکھیں دیں' اور دل دیئے تم لوگ کم ہی شکر گذار ہوتے ہو۔

سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ اس کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں:

یعنی اس عظیم الشان کائنات میں اس نے بے حد و حساب چیزیں بنائی ہیں' مگر کوئی ایک چیز بھی ایسی نہیں ہے جو بے ڈھنگی اور بے تکی ہو۔ ہر شے اپنا الگ حسن رکھتی ہے۔ ہر شے اپنی جگہ متناسب اور موزوں ہے جو چیز جس کام کے لیے بھی اس نے بنائی ہے اس کے لیے موزوں ترین شکل پر مناسب ترین تصور کیا جا سکتا۔ ہوا اور پانی جن مقاصد کے لیے بنائے گئے ہیں ان کے لیے ہوا ٹھیک ایسی ہی ہے جیسی ہونی چاہئے اور پانی وہی اوصاف رکھتا ہے جیسے ہونے چاہئیں۔ تم خدا کی بنائی ہوئی کسی چیز کے نقشے میں کسی کوتاہی کی نشان دہی نہیں کر سکتے' نہ اس میں کوئی ترمیم پیش کر سکتے ہو۔

پہلے اس نے براہ راست اپنے تخلیقی عمل (Direct Creation) سے انسان کو پیدا کیا' اور اس کے بعد خود اسی انسان کے اندر تناسل کی یہ طاقت رکھ دی کہ اس کے نطفہ سے ویسے ہی انسان پیدا ہوتے چلے جائیں۔ ایک کمال یہ تھا کہ زمین کے مواد کو جمع کر کے ایک تخلیقی حکم سے اس میں وہ زندگی اور وہ شعور تعقل پیدا کردیا جس سے انسان جیسی ایک حیرت انگیز مخلوق وجود میں آ گئی۔ اور دوسرا کمال یہ ہے کہ آئندہ مزید انسانوں کو پیدائش کے لیے ایک ایسی عجیب مشینری خود انسانی ساخت کے اندر رکھ دی جس کی ترکیب اور کارگزاری کو دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔

بڑی حقارت کے ساتھ وہ اس کو ایک غیر سائنٹیفک نظریہ قرار دے کر گویا پھینک دیتے ہیں۔ لیکن انسان کی نہ سہی تمام انواع حیوانی کی نہ سہی اولین جرثومہ حیات کی براہ راست تخلیق سے تو وہ کسی طرح پیچھا نہیں چھڑا سکتے۔ اس تخلیق کو نہ مانا جائے تو پھر یہ انتہائی لغو بات ماننی پڑے گی کہ زندگی کی ابتدا محض ایک حادثہ کے طور پر ہوئی ہے' حالاں کہ صرف ایک خلیہ (Cell) والے حیوان میں زندگی کی سادہ ترین صورت بھی اتنی پیچیدہ اور نازک حکمتوں سے لبریز ہے کہ اسے حادثہ کا نتیجہ قرار دینا اس سے لاکھوں درجہ غیر سائنٹیفک بات ہے جتنا نظریہ ارتقاء کے قائلین نظریہ تخلیق کو ٹھہراتے ہیں۔ اور اگر ایک دفعہ آدمی یہ مان لے کہ حیات کا پہلا جرثومہ براہ راست تخلیق سے وجود میں آیا تھا تو پھر آخر یہی ماننے میں کیا قباحت ہے کہ ہر نوع حیوانی کا پہلا فرد خالق کے تخلیقی عمل سے پیدا ہوا ہے' اور پھر اس کی نسل تناسل (Procreation) کی مختلف صورتوں سے چلی ہے۔ اس بات کو مان لینے سے وہ بہت سی گتھیاں حل ہو جاتی ہیں جو ڈارونیت کے علمبر داروں کی ساری سائنٹفک شاعری کے باوجود ان کے نظریہ ارتقاء میں غیر حل شدہ رہ گئی ہیں۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک انتہائی باریک خورد بینی وجود سے بڑھا کر اسے پوری انسانی شکل تک پہنچایا اور اس کا جسم سارے اعضاء وجوارح کے ساتھ مکمل کردیا۔

یہ بات ذہن میں رہے کہ روح سے مراد محض وہ زندگی نہیں ہے جس کی بدولت ایک ذی حیات جسم کی مشین متحرک ہوتی ہے' بلکہ اس سے مراد وہ خاص جوہر ہے جو فکر و شعور اور عقل و تمیز اور فیصلہ اختیار کا حامل ہوتا ہے جس کی بدولت انسان تمام دوسری مخلوقات ارضی سے ممتاز ایک صاحب شخصیت ہستی' صاحب انا ہستی' اور حامل خلافت ہستی بنتا ہے۔ اس روح کو اللہ تعالیٰ نے اس معنی میں فرمایا ہے کہ وہ اسی کی ملکیت ہے اور اس کی ذات پاک کی طرف اس کا انتساب اسی طرح کا ہے جس طرح ایک چیز اپنے مالک کی طرف منسوب ہو کر اس کی چیز کہلاتی ہے۔ یا پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کے اندر علم' فکر' شعور' ارادہ' فیصلہ' اختیار اور ایسے ہی دوسرے جو اوصاف پیدا ہوئے ہیں وہ سب اللہ تعالیٰ کی صفات کے پرتو ہیں۔ ان کا سرچشمہ مادے کی کوئی ترکیب نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ اللہ کے علم سے اس کو علم ملا ہے' اللہ کی حکمت سے اس کو دانائی ملی ہے' اللہ کے اختیار سے اس کو اختیار ملا ہے۔ یہ اوصاف کسی بے علم' بے دانش اور بے اختیار ماخذ سے انسان کے اندر نہیں آ گئے ہیں۔

سے درست کیا''، ''اس کے اندر روح پھونکی''۔ اس لیے کہ اس وقت تک وہ خطاب کے لائق نہ تھا۔ پھر جب روح پھونک دی گئی تو اب اس سے فرمایا جا رہا ہے کہ ''تم کو کان دیے''، ''تم کو آنکھیں دیں''، ''تم کودل دیے'' اس لیے کہ حامل روح ہو جانے کے بعد ہی وہ اس قابل ہوا کہ اسے مخاطب کیا جائے۔ کان اور آنکھوں سے مراد وہ ذرائع ہیں جن سے انسان علم حاصل کرتا ہے۔ اگرچہ حصول علم کے ذرائع ذائقہ اور لامسہ اور شامہ بھی ہیں۔ لیکن سماعت و بینائی تمام دوسرے حواس سے بڑے اور اہم ذرائع ہیں۔ اس لیے قرآن جگہ جگہ انہی دو کو خدا کے نمایاں عطیوں کی حیثیت سے پیش کرتا ہے۔ اس کے بعد دل سے مراد وہ ذہن ہے جو حواس کے ذریعہ سے حاصل شدہ معلومات کو مرتب کر کے ان سے نتائج نکالتا ہے اور عمل کی مختلف امکانی راہوں میں سے کوئی ایک راہ منتخب کرتا ہے اور اس پر چلنے کا فیصلہ کرتا ہے۔(۶۲)

تخلیق انسان او ر اس کے نسلی تسلسل کے بارے میں قرآن کا بیان زیادہ منطقی اور مدلل ہے۔ اس بیان سے انسان کی اخلاقی شخصیت' ذمہ دارانہ حیثیت اور اشرف المخلوقات ہونے کا تصور زیادہ بہتر طور پر اجاگر ہوتا ہے۔ قرآن کے مطابق وہ خلیفہ ہے جو نیابت الٰہی جیسے عظیم فریضہ کی ادائیگی پر مامور کیا گیا ہے۔

انسان اور رب تعالیٰ

ایک اہم بات جس کی طرف انسان کی توجہ دلائی گئی ہے وہ انسان اور رب تعالیٰ کا تعلق ہے۔ انسان تھوڑی سی قوت کے بل بوتے پر کبھی کبھی غلط فہمی کا بھی شکار ہوا ہے۔ وہ اپنے آپ کو مالک سمجھنے لگ گیا ہے بلکہ خدائی دعوے بھی کر بیٹھا ہے یہ دوسری انتہا ہے جس پر اسے بہر حال نہیں پہنچنا چاہئے تھا۔ قرآن پورے زور استدلال سے ثابت کرتا ہے کہ انسان خدا نہیں۔ وہ اس کائنات میں مالکانہ حقوق بھی نہیں رکھتا وہ شتر بے مہار بھی نہیں بلکہ اس کا بندہ ہے اور بندہ بھی کمزور جسے چند روزہ زندگی میں خدائی احکام کی پیروی کرنی ہے وہ یہاں خدا کے نائب اور بندہ کی حیثیت سے رہ رہا ہے خدا کی حیثیت سے نہیں ہے۔ اس سے انسان کا بے جا غرور بھی ٹوٹتا ہے' اس کی عظمت بھی واضح ہوتی ہے اور اس کی صحیح حیثیت کا تعین بھی ہوتا ہے۔ قرآن پاک نے اسے یوں بیان کیا ہے۔

اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّاَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ○ فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ

ہاں تو کیا تم نے یہ خیال کیا تھا کہ ہم نے تم کو یونہی مہمل (خالی از حکمت) پیدا کر دیا ہے اور یہ کہ تم ہمارے پاس نہیں لائے جاؤ گے۔ اللہ تعالیٰ بہت ہی عالیشان ہے جو کہ بادشاہ حقیقی ہے اس کے سوا کوئی بھی عبادت کے لائق نہیں اور وہ عرش عظیم کا مالک ہے اور جو شخص اللہ کے ساتھ کسی اور کو پکارے گا اس کے معبود ہونے پر ہے اس کے پاس کوئی بھی دلیل نہیں تو اس کا حساب اسی کے رب کے ہاں ہو گا۔ یقیناً کافروں کو فلاح نہ ہو گی۔

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ فَاَصْبَحَ هَشِيْمًا تَذْرُوْهُ الرِّيٰحُ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ مُّقْتَدِرًاO اَلْمَالُ وَ الْبَنُوْنَ زِيْنَةُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّ خَيْرٌ اَمَلًا (۶۴)

اور ان لوگوں سے دنیوی زندگی کی حالت بیان فرمایئے کہ وہ ایسی ہے جیسے آسمان سے ہم نے پانی برسایا ہو پھر اس کے ذریعے سے زمین کی نباتات خوب گنجان ہو گئی ہوں پھر وہ ریزہ ریزہ ہو جائے کہ اس کو ہوا اڑائے لیے پھرتی ہو اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر پوری قدرت رکھتے ہیں۔ مال اور اولاد حیات دنیا کی ایک رونق ہے اور جو اعمال صالحہ باقی رہنے والے ہیں وہ آپ کے رب کے نزدیک ثواب کے اعتبار سے بھی ہزار درجہ بہتر ہیں اور امید کے اعتبار سے بھی ہزار درجہ بہتر ہیں۔

يٰٓاَيُّهَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ O الَّذِيْ خَلَقَكَ فَسَوّٰكَ فَعَدَلَكَO فِيْٓ اَيِّ صُوْرَةٍ مَّاشَآءَ رَكَّبَكَ (۶۵)

اے انسان تجھ کو کس چیز نے اپنے ایسے رب کریم کے ساتھ بھول میں ڈال رکھا ہے جس نے تجھ کو انسان بنایا پھر تیرے اعضاء کو درست کیا پھر تجھ کو اعتدال پر بنایا (اور) جس صورت میں چاہا تجھ کو ترکیب دے دیا۔

فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَّغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ وَ نُقِرُّ فِي الْاَرْحَامِ مَانَشَآءُ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْٓا اَشُدَّ كُمْ وَ مِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰى وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنْ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْئًا (۶۶)

تو ہم نے تم کو مٹی سے بنایا پھر نطفہ سے پھر خون کے لوتھڑے سے پھر بوٹی سے جو پوری

لاتے ہیں پھر تاکہ تم اپنی جوانی تک پہنچ جاؤ اور بعضے تم میں وہ بھی ہیں جو پہلے ہی مر جاتے ہیں اور بعض تم میں وہ نکمی عمر (یعنی بڑھاپے) تک پہنچا دیا جاتا ہے جس کا اثر یہ ہے کہ ایک چیز سے با خبر ہو کر پھر بے خبر ہو جاتا ہے۔

اَوَ لَمْ يَرَ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ O وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّنَسِيَ خَلْقَهٗ (٦٧)

کیا آدمی کو یہ معلوم نہیں کہ ہم نے اس کو نطفہ سے پیدا کیا سو وہ علانیہ اعتراض کرنے لگا اور اس نے ہماری شان میں ایک عجیب مضمون بیان کیا اور اپنی اصل کو بھول گیا۔

اَفَرَءَيْتُمْ مَّاتُمْنُوْنَO ءَ اَنْتُمْ تَخْلُقُوْنَهٗٓ اَمْ نَحْنُ الْخٰلِقُوْنَO نَحْنُ قَدَّرْنَا بَيْنَكُمُ الْمَوْتَ وَ مَانَحْنُ بِمَسْبُوْقِيْنَO عَلٰٓى اَنْ نُّبَدِّلَ اَمْثَالَكُمْ وَ نُنْشِئَكُمْ فِيْ مَا لَا تَعْلَمُوْنَO وَ لَقَدْ عَلِمْتُمُ النَّشْاَةَ الْاُوْلٰى فَلَوْلَا تَذَكَّرُوْنَ (٦٨)

اچھا پھر یہ بتلاؤ تم جو (عورتوں کے رحم میں) منی پہنچاتے ہو اس کو تم آدمی بناتے ہو یا ہم بنانے والے ہیں ہم ہی نے تمہارے درمیان موت کو ٹھہرا رکھا ہے اور ہم اس سے عاجز نہیں ہیں کہ تمہاری جگہ اور تم جیسے پیدا کر دیں اور تم کو ایسی صورت میں بنا دیں جن کو تم جانتے ہی نہیں اور تم کو اول پیدائش کا علم ہے پھر تم کیوں نہیں سمجھتے؟

وَ اِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فِى الْبَحْرِ ضَلَّ مَنْ تَدْعُوْنَ اِلَّآ اِيَّاهُ فَلَمَّا نَجّٰكُمْ اِلَى الْبَرِّ اَعْرَضْتُمْ وَ كَانَ الْاِنْسَانُ كَفُوْرًاO اَفَاَمِنْتُمْ اَنْ يَّخْسِفَ بِكُمْ جَانِبَ الْبَرِّ اَوْ يُرْسِلَ عَلَيْكُمْ حَاصِبًا ثُمَّ لَاتَجِدُوْا لَكُمْ وَكِيْلًاO اَمْ اَمِنْتُمْ اَنْ يُّعِيْدَكُمْ فِيْهِ تَارَةً اُخْرٰى فَيُرْسِلَ عَلَيْكُمْ قَاصِفًا مِّنَ الرِّيْحِ فَيُغْرِقَكُمْ بِمَا كَفَرْتُمْ ثُمَّ لَا تَجِدُوْا لَكُمْ عَلَيْنَا بِهٖ تَبِيْعًا (٦٩)

اور جب تم کو سمندر میں کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو بجز اللہ کے جن کی تم عبادت کرتے تھے سب غائب ہو جاتے ہیں۔ پھر جب تم کو وہ خشکی کی طرف بچا لاتا ہے تو پھر تم پھر جاتے ہو اور انسان ہے بڑا نا شکر گزار۔ تو کیا تم اس بات سے بے فکر ہو بیٹھے کہ وہ تم کو خشکی کی جانب میں لا کر زمین میں دھنسا دے یا تم پر کوئی ایسی تند ہوا بھیج دے جو کنکر پتھر برسانے لگے پھر تم کسی کو اپنا

قُتِلَ الْاِنْسَانُ مَآ اَکْفَرَہٗ O مِنْ اَیِّ شَیْءٍ خَلَقَہٗO مِنْ نُّطْفَةٍ خَلَقَہٗ فَقَدَّرَہٗ (۷۰)

انسان پر خدا کی مار وہ کیسا نا شکر ہے (وہ دیکھتا نہیں کہ) اللہ تعالیٰ نے اس کو کیسی چیز سے پیدا کیا نطفہ سے بنایا اور پھر اس کا اندازہ مقرر کیا۔

انسان کے بگڑنے او ر اس کی ذلت و بے راہ روی کے یہی دو نقاط ہیں جنہیں اسلام نے بیان کیا۔ مندرجہ بالا آیات میں اللہ نے انسان کی بے بسی اور اس کی حیثیت بیان کر کے بتایا ہے کہ اسے مغرور متکبرٗ غیر ذمہ دار اور ظالم نہیں بننا چاہئے بلکہ اپنی کمزوریوں کو ملحوظ رکھ کر اعتدال پر رہنا چاہیئے۔ اسلام انسان کے متوازن مقام کو اس طرح متعین کرتا ہے کہ اسے کائنات سے مرعوب ہونے کی ضرورت ہے نہ اپنے آپ کو ایسی بلند ہستی تصور کرلینے کی کہ خدائی احکام ہی سے رو گردانی کرنے لگے۔ انسان اور اللہ کا تعلق خالق و مخلوق کا ہے۔ قرآن نے واضح طور پر تخلیق انسان کا ذکر کیا ہے اس لیے انسانی وجود کا بخت و اتفاق سے ہونا قرآنی تصور کے منافی ہے۔ قرآن یہ بھی بیان کرتا ہے کہ انسانی تخلیق بے مقصد نہیں وہ کہتا ہے :

وَ مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ (۷۱)

''اور میں نے جن اور انسان کو اس لیے پیدا کیا کہ وہ میری عبادت کریں''۔

انسان اور اس کے رب کے تعلق میں ایک خاص بات یہ ہے کہ رب تعالیٰ نے اسے ذمہ داری سونپی ہے اور وہ اس سے اس کا حساب لے گا۔ قرآن نے اسے نمایاں طور پر بیان کیا ہے:

اَیَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ یُّتْرَکَ سُدًی O اَلَمْ یَکُ نُطْفَةً مِّنْ مَّنِیٍّ یُّمْنٰیO ثُمَّ کَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوّٰیO فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَیْنِ الذَّکَرَ وَالْاُنْثٰیO اَلَیْسَ ذٰلِکَ بِقٰدِرٍ عَلٰۤی اَنْ یُّحْیِیَ الْمَوْتٰی (۷۲)

کیا انسان خیال کرتا ہے کہ یونہی چھوڑ دیا جائے گا کیا وہ منی کا جو رحم میں ڈالی جاتی ہے ایک قطرہ نہ تھا پھر لوتھڑا ہوا پھر اللہ نے اس کی تخلیق کی پھر اس کے اعضاء درست کئے پھر اس کی دو قسمیں بنائیں۔ مرد اور عورت کیا اللہ اس پر قادر نہیں کہ وہ مُردوں کو جلا اٹھائے۔

اللہ اور انسان کے تعلق میں اسلام دو امور پر توجہ مرکوز کرتا ہے ایک یہ کہ انسان مخلوق ہے اور

خالق نے اپنی مشیت میں افراد کے لیے انفرادی طور پر اور قوموں کے لیے اجتماعی طور پر ایک مہلت رکھی ہے۔ اس مدت میں انہیں عمل کرنے کی کھلی اجازت ہے۔ پھر موت آتی ہے اور وہ مہلت ختم ہو جاتی ہے پھر آخرت کا نیا نظام ہو گا اور وہاں اس مہلت کے بارے پوچھا جائے گا۔ قصہ آدم و ابلیس میں قرآن نے دو حقائق بیان فرمائے ہیں ایک یہ کہ زمین پر قیام کی مدت متعین ہے اور دوسرے یہ کہ رب تعالیٰ کی طرف سے درست طرزِ عمل کے لیے رہنمائی مہیا کی جائے گی لیکن اس پر عمل کرنے یا نہ کرنے کا جبر نہیں ہو گا۔ انسان اپنے اختیار و ارادہ سے جو طرزِ عمل اختیار کرے گا اس کا بدلہ اسے ضرور ملے گا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّ مَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ (۷۳)

تب ہم نے حکم دیا کہ یہاں سے اتر جاؤ تم ایک دوسرے کے دشمن ہو اور تمہارے لیے زمین میں ایک مدت تک ٹھکانا اور معاش مقرر کر دیا گیا ہے۔

قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (۷۴)

ہم نے فرمایا کہ تم سب یہاں سے اتر جاؤ جب تمہارے پاس میری طرف سے ہدایت پہنچے تو جنہوں نے میری ہدایت کی پیروی کی ان کو نہ کچھ خوف ہو گا اور نہ وہ غمناک ہوں گے۔

انسان ان دو امور سے بندھا ہوا ہے۔ اس کی زندگی محدود اور متعین ہے اور اس تعلق کو خوش گوار بھی بنایا جا سکتا ہے اور نا خوش گوار بھی۔ اس کی پوری زندگی کا ریکارڈ نئے نظام کے آغاز پر اسے پیش کر دیا جائے گا اور کسی پر ظلم نہیں ہو گا:

اَلْيَوْمَ تُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ لَا ظُلْمَ الْيَوْمَ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ (۷۵)

آج کے دن ہر شخص کو اس کے اعمال کا بدلہ دیا جائے گا آج بے انصافی نہیں ہو گی بے شک اللہ جلد حساب لینے والا ہے۔

وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ وَ نُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا يَّلْقٰهُ مَنْشُوْرًا O اِقْرَاْ كِتٰبَكَ

اور ہم نے ہر انسان کے اعمال کو (بہ صورت کتاب) اس کے گلے میں لٹکا دیا ہے اور قیامت کے روز وہ کتاب اسے نکال کر دکھائیں گے جسے وہ کھلا ہوا دیکھے گا۔ اپنی کتاب پڑھ لو تو آج اپنا آپ ہی محاسب کافی ہے۔ جو شخص ہدایت کی راہ اختیار کرتا ہے تو اپنے لیے اختیار کرتا ہے اور جو گمراہ ہوتا ہے تو اس کا ضرر بھی اسی کو ہو گا اور کوئی شخص کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ اور جب تک ہم پیغمبر نہ بھیج لیں عذاب نہیں دیا کرتے۔

اطاعت اور بغاوت کا رویہ جس طرح افراد پر اثر انداز ہوتا ہے اسی طرح قوموں پر بھی۔ قوموں کی مہلت بھی متعین ہے اور ان کی جزا و سزا کا قانون بھی سے طے شدہ ہے۔ جس طرح ایک فرد ایک متعین مدت کے بعد مر جاتا ہے اسی طرح قومیں بھی مٹ جاتی ہیں البتہ قوموں کی ہلاکت بعض اوقات بڑی عبرت انگیز ہوتی ہے قرآن نے اس بارے میں مفصل تبصرے کیے ہیں ہم نمونہ کے طور پر صرف ایک اقتباس نقل کریں گے۔ ارشاد الٰہی ہے:

وَاِذَآ اَرَدْنَآ اَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا فَفَسَقُوْا فِيْهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنٰهَا تَدْمِيْرًا○ وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْ بَعْدِ نُوْحٍ وَكَفٰى بِرَبِّكَ بِذُنُوْبِ عِبَادِهٖ خَبِيْرًا بَصِيْرًا[۷۷]

جب ہمارا ارادہ کسی بستی کے ہلاک کرنے کا ہوتا ہے تو وہاں کے آسودہ لوگوں کو (خواہش پر) مامور کر دیا تو وہ نافرمانیاں کرتے ہیں اس پر اللہ کا حکم ثابت ہو گیا اور ہم نے اسے ہلاک کر ڈالا۔ اور ہم نے نوح کے بعد بہت سی امتوں کو ہلاک کرڈالا اور تمہارا پرور دگار اپنے بندوں کے گناہوں کو جاننے اور دیکھنے کے لیے کافی ہے۔

اسلامی نقطہ نظر سے انسان خدا نہیں ہے۔ غیر ذمہ دار اور خود مختار بھی نہیں ہے کہ جو چاہے کرتا پھرے۔ اس کی آزادی اور خود مختاری کی ایک حد ہے۔ اس طرح وہ لامحدود زندگی کا مالک نہیں ہے۔ اس کے خالق نے اس کے لیے موت کا دن مقرر کر رکھا ہے۔ اپنے رب کے ساتھ اس کا مطلوب تعلق اطاعت، عبادت اور محبت کا ہے۔ یہی تعلق اس کی فلاح کا ضامن ہے۔ تعلق کی دیگر تمام نوعیتیں اس کے لیے مشکل کا باعث بنیں گی۔ انسانی فلاح کا دارو مدار اس تعلق کی نوعیت پر ہے۔ قرآن نے کہا:

اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (۷۸)

یہ کتاب اس میں کچھ شک نہیں۔ ڈرنے والوں کی رہنما ہے جو غیب پر ایمان لاتے' آداب کے ساتھ نماز پڑھتے اور جو کچھ ہم نے ان کو عطا فرمایا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں اورجو کتاب آپ پر نازل ہوئی اور جو کتابیں آپ سے پہلے نازل ہوئیں سب پر ایمان لاتے اور آخرت کا یقین رکھتے ہیں۔ یہی لوگ اپنے پروردگار کی طرف سے ہدایت پر ہیں اور یہی نجات پانے والے ہیں۔

دنیا میں اس وقت جو فساد ہے اس کا ایک بڑا سبب انسان کی رب ناشناسی ہے۔ وہ اپنے محدود مفادات اور خواہشات کی بنا پر اقدام کرتا ہے اور وہ اقدام انسانوں کے لیے بھی اور کائنات کے لیے بھی نقصان کا باعث بنتا ہے۔ رب کریم نے اس طرف توجہ دلاتے ہوئے فرمایا۔

ظَهَرَالْفَسَادُ فِى الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِى النَّاسِ لِيُذِيْقَهُمْ بَعْضَ الَّذِىْ عَمِلُوْا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ (۷۹)

خشکی اور تری میں لوگوں کے اعمال کے سبب فساد پھیل گیا ہے تاکہ اللہ ان کو ان کے بعض اعمال کا مزہ چکھائے عجیب نہیں کہ وہ باز آ جائیں۔

انسا ن اور کائنات

لیزلی پال (Leslei Paul) انسان اور کائنات کے تعلق پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ انسان اور کائنات کے باہمی تعلقات جس قدر زیادہ واضح ہوتے ہیں اور ان کی معقولیت نکھرتی جاتی ہے اسی نسبت سے مذہب قوی ہوتا جاتا ہے۔(۸۰) مختلف مذاہب میں مظاہر فطرت کی پرستش کا سبب ہی یہ ہے کہ انسان اور کائنات کے ربط کو نہیں سمجھا گیا۔ انسان کائنات کی مختلف پرشکوہ چیزیں دیکھ کر ان کے سامنے جھکنے لگتا ہے حالانکہ اس کے لیے ایسا کرنے کی کوئی گنجائش نہیں۔ اسلام ہمیں یہ بتاتا ہے کہ کائنات کی مختلف اشیاء انسان کے لیے بنائی گئیں اور وہ اس کی خدمت پر مامور ہیں۔ یہ ان سے کام لے سکتا ہے اسے ان کے سامنے سجدہ ریز ہونے کی ضرورت نہیں۔ اسی طرح قرآن اس تصور کو بھی تسلیم نہیں کرتا کہ کائنات اور انسان ایک دوسرے کے مد مقابل ہیں اور انسان بزور اسے

سے انتفاع خالق کائنات کی منصوبہ بندی کے عین مطابق ہے۔ قرآن نے تسخیر کی اصطلاح استعمال کرکے اس تصور کی وضاحت کی ہے۔ قرآن کے مطابق کائنات کو انسان کی منفعت کے لیے بنایا گیا ہے اور اسلامی نقطہ نظر یہ ہے کہ انسان و کائنات دونوں اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں اور دونوں ایک مقصد تخلیق کے مطابق سرگرم عمل ہیں۔ انسان اور کائنات میں تصادم نہیں توافق ہے۔ اجزاء کائنات اطاعت رب میں سرگرم ہیں اور کائنات کا نظام خالق کائنات کے قوانین اور اس کے تکوینی حکم کے مطابق چل رہا ہے۔ انسان سے یہ مطلوب ہے کہ وہ اپنے اختیار و ارادہ سے کائناتی نظام سے ہم آہنگی رکھتے ہوئے اطاعت اور بندگی رب کی راہ پہ چلے۔ قرآن مجید نے تسخیر کائنات' اطاعت کائنات اور انسانی ہم آہنگی اور عبادت رب کے بارے میں واضح اعلانات کئے ہیں۔ قرآن پاک میں بڑے دلنشین انداز میں بیان کیا گیا ہے:

خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِى الْاَرْضِ جَمِيْعًا(٨١)

جو کچھ بھی زمین میں موجود ہے اس نے سب کا سب تمہارے فائدے کے لیے پیدا کیا۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَلَكُمْ مَّا فِى الْاَرْضِ وَ الْفُلْكَ تَجْرِىْ فِى الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ وَيُمْسِكُ السَّمَآءَ اَنْ تَقَعَ عَلَى الْاَرْضِ اِلَّا بِاِذْنِهٖ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ(٨٢)

کیا تم دیکھتے نہیں کہ جتنی چیزیں زمین میں ہیں اللہ نے تمہارے زیر فرمان کر رکھی ہیں اور کشتیاں جو اسی کے حکم سے دریا و سمندر میں چلتی ہیں۔ وہ آسمان کو تھامے رہتا ہے کہ زمین پہ نہ گر پڑے مگر اس کے حکم سے۔ بے شک اللہ نہایت شفقت کرنے والا مہربان ہے۔

وَالْاَنْعَامَ خَلَقَهَا لَكُمْ فِيْهَا دِفْءٌ وَّمَنَافِعُ وَمِنْهَا تَاْكُلُوْنَO وَلَكُمْ فِيْهَا جَمَالٌ حِيْنَ تُرِيْحُوْنَ وَحِيْنَ تَسْرَحُوْنَO وَ تَحْمِلُ اَثْقَالَكُمْ اِلٰى بَلَدٍ لَّمْ تَكُوْنُوْا بٰلِغِيْهِ اِلَّا بِشِقِّ الْاَنْفُسِ اِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌO وَّالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيْرَ لِتَرْكَبُوْهَا وَزِيْنَةً وَيَخْلُقُ مَالَا تَعْلَمُوْنَO وَعَلَى اللّٰهِ قَصْدُ السَّبِيْلِ وَمِنْهَا جَآئِرٌ وَلَوْ شَآءَ لَهَدٰكُمْ اَجْمَعِيْنَO هُوَالَّذِىْ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً لَّكُمْ مِّنْهُ شَرَابٌ وَّمِنْهُ شَجَرٌ فِيْهِ تُسِيْمُوْنَO يُنْبِتُ لَكُمْ بِهِ الزَّرْعَ وَالزَّيْتُوْنَ وَالنَّخِيْلَ وَالْاَعْنَابَ وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَO وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمُ مُسَخَّرٰتٌ بِاَمْرِهٖ اِنَّ

بِكُمْ وَاَنْهٰرًا وَّسُبُلًا لَّعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَo وَعَلٰمٰتٍ وَ بِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُوْنَo اَفَمَنْ يَّخْلُقُ كَمَنْ لَّا يَخْلُقُ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَo وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا اِنَّ اللّٰهَ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌo (۸۳)

اور جانوروں کو پیدا کیا جن میں تمہارے لیے سردی سے حفاظت کا سامان ہے اور منفعتیں ہیں اور ان میں سے بعض کو تم کھاتے ہو۔ ان میں تمہارے لیے ایک شان جمال ہے جب کہ تم صبح ان کو لے جاتے ہو اور شام واپس لاتے ہو۔ وہ تمہارے بوجھ ڈھوکر اس مقام تک لے جاتے ہیں جہاں تک تم بغیر جانکاہی نہیں پہنچ سکتے۔ تمہارا رب بڑا مہربان اور رحم کرنے والا ہے۔ اور گھوڑے اور خچر اور گدھے تمہاری سواری کے لیے ہیں اور سامان زیست ہیں۔ اللہ بہت سی چیزیں پیدا کرتا ہے جن کا تم کو علم بھی نہیں ہے .... وہی ہے جس نے آسمان سے پانی اتارا۔ اس میں کچھ تمہارے پینے کے لیے ہے اور کچھ درختوں کی پرورش کے کام آتا ہے جن سے تم اپنے جانوروں کا چارا حاصل کرتے ہو۔ اسی پانی سے اللہ تمہارے لیے کھیتی اور کھجور اور انگور اور طرح طرح کے پھل اگاتا ہے، ان چیزوں میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو غور فکر سے کام لیتے ہیں۔ اسی نے تمہارے لیے رات اور دن، سورج اور چاند اور تارے مسخر کئے ہیں۔ یہ سب اسی اللہ کے حکم سے مسخر ہیں۔ ان میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں۔ اور بہت سی مختلف الانواع چیزیں جو اس نے زمین میں تمہارے لیے پیدا کی ہیں۔ ان میں سبق حاصل کرنے والوں کے لیے بڑی نشانی ہے۔ اور وہ اللہ ہی ہے جس نے سمندر کو مسخر کیا کہ تم اس سے تازہ گوشت (مچھلی) نکال کر کھاؤ اور زیست کا سامان (موتی وغیرہ) نکالو جن کو تم پہنتے ہو۔ اور تو دیکھتا ہے کہ کشتیاں پانی میں تیرتی ہوئی سمندر میں بہتی چلی جاتی ہیں۔ چنانچہ سمندر کو اس لیے بھی مسخر کیا کہ تم لوگ اللہ کا فضل تلاش کرو (یعنی تجارت کرو) شاید کہ تم شکر بجا لاؤ۔ اس نے زمین پر پہاڑ لگا دیئے کہ زمین تم کو لے کر نہ جھک جائے اور دریا اور راستے بنا دیئے کہ منزل مقصود کی راہ پاؤ۔ اور بہت سی علامات بنائیں، منجملہ ان کے تارے بھی ہیں۔ جن سے لوگ راستہ معلوم کرتے ہیں۔ تو جو یہ سب کچھ پیدا کرے کیا وہ ویسا ہے جو کچھ پیدا نہ کرسکے تو پھر تم غور کیوں نہیں کرتے۔ اور اگر تم اللہ کی نعمتوں کا شمار کرو تو ان کو بے حساب پاؤ گے۔

الَّذِىْ جَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الشَّجَرِ الْاَخْضَرِ نَارًا فَاِذَآ اَنْتُمْ مِّنْهُ تُوْقِدُوْنَ (۸۴)

فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ اِلٰى طَعَامِهٖٓO اَنَّاصَبَبْنَا الْمَآءَ صَبًّاO ثُمَّ شَقَقْنَا الْاَرْضَ شَقًّاO فَاَنْبَتْنَا فِيْهَا حَبًّاO وَّ عِنَبًا وَّقَضْبًاO وَّ زَيْتُوْنًا وَّنَخْلًاO وَّ حَدَآئِقَ غُلْبًاO وَّفَاكِهَةً وَّاَبًّاO مَّتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ(۸۵)

سو انسان کو چاہئے کہ اپنے کھانے کی طرف نظر کرے کہ ہم نے عجیب طور پر پانی برسایا پھر عجیب طور پر زمین کو پھاڑا پھر ہم نے اس میں غلہ اور انگور اور ترکاری اور زیتون اور کھجور اور گنجان باغ اور میوے اور چارہ پیدا کیا (بعض چیزیں تمہارے) اور (بعض چیزیں) تمہارے مواشی کے فائدے کے لئے۔

یہی مضمون سورہ نازعات میں بھی بیان کیا گیا ہے۔ قرآن پاک اشیاء کائنات کو انسان کے لیے فائدہ مند، خدمت گذار اور مسخر قرار دے رہا ہے ان کے سامنے انسان کا سر بسجود ہونا اور ان سے حاجت روائی کی دعا کرنا اس کی کم فہمی اور ناعاقبت اندیشی ہے۔ مذکورہ بالا آیات میں انسان کو یہ باور کرایا گیا کہ زمین کی جتنی چیزیں ہیں وہ سب اس کی خدمت اور منفعت کے لیے مسخر کی گئی ہیں اور آسمان کی بھی بہت سی چیزوں کا یہی حال ہے۔ یہ درخت، یہ دریا، یہ سمندر، یہ پہاڑ، یہ جانور، یہ رات اور دن یہ تاریکی اور روشنی، یہ چاند یہ سورج اور یہ تارے غرض یہ سب چیزیں جن کو انسان دیکھتا ہے اس کی خادم ہیں، اس کی منفعت کے لیے ہیں اور انہیں اس کے لیے کار آمد بنایا گیا ہے۔ اسے بتایا گیا کہ اسے سب پر فضیلت ہے، اسے ان سب سے زیادہ عزت دی گئی ہے اور اس کو ان کا مخدوم بنایا گیا ہے۔ یہ بڑی بے عقلی کی بات ہے کہ انسان اپنے خادموں کے سامنے سر جھکاتا پھرے، ان کو اپنا حاجت روا سمجھے اور ان کے آگے دست سوال دراز کرے، ان سے مدد کی التجائیں کرے، ان سے ڈرتا اور خوف کھاتا رہے اور ان کی عظمت و بزرگی کے گیت گاتا رہے۔ ایسا کرنے سے نہ صرف اپنے آپ کو ذلیل کرتا ہے اور اپنا مرتبہ گراتا ہے بلکہ خادموں کا خادم اور غلاموں کا غلام بن کر اپنے خالق و مالک کی بھی ناشکری کرتا ہے۔(۸۶)

کائنات کی مقصدیت

قرآن کے مطابق اس کائنات کا خالق اللہ ہے اور اس نے اسے ایک مقصد کے تحت بنایا

چلانے والا اوراس کو سنبھالنے والا موجود ہے اور وہی ایک مقصدیت کے تحت پورے نظام عالم کو چلا رہا ہے۔

ارشادی باری ہے:

وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَo مَا خَلَقْنٰهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَايَعْلَمُوْنَo اِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ مِيْقَاتُهُمْ اَجْمَعِيْنَo(٨٧)

ہم نے آسمانوں اور زمین اور ان چیزوں کو جو ان کے درمیان ہیں کھیل کے طور پر پیدا نہیں کیا۔ ہم نے تو ان کو مقتضائے حکمت کے مطابق پیدا کیا ہے مگر اکثر لوگ نہیں جانتے۔ یقیناً ان سب کے لیے فیصلہ کے دن کا وقت مقرر ہے۔

اَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ مَاخَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَ اَجَلٍ مُّسَمًّى وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ بِلِقَآئِ رَبِّهِمْ لَكٰفِرُوْنَ(٨٨)

کیا انہوں نے خود اپنے دلوں میں غور نہیں کیا کہ اللہ نے آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان کی چیزوں کو جو پیدا کیا ہے تو حکمت کے مطابق پیدا کیا ہے اوران کے لیے ایک وقت مقرر ہے؟ مگر بہت سے لوگ ہیں جو اپنے رب کی ملاقات کے منکر ہیں۔

تکوینی نظام

کائنات اللہ کے بنائے ہوئے قوانین کے تحت چل رہی ہے اور کائنات کا ایک ذرہ بھی اس نظام سے ادھر ادھر نہیں ہو سکتا۔ ارشادی خدا وندی ہے:

سُبْحٰنَ الَّذِیْ خَلَقَ الْاَ زْوَاجَ كُلَّهَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ وَمِنْ اَنْفُسِهِمْ وَمِمَّا لَايَعْلَمُوْنَoوَاٰيَةٌ لَّهُمُ الَّيْلُ نَسْلَخُ مِنْهُ النَّهَارَ فَاِذَاهُمْ مُّظْلِمُوْنَo وَالشَّمْسُ تَجْرِیْ لِمُسْتَقَرٍّلَّهَا ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِo وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ حَتّٰى عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِيْمِoلَا الشَّمْسُ يَنْۢبَغِیْ لَهَآ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ وَكُلٌّ فِیْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ(٨٩)

اور ایک نشانی ان کے لیے رات ہے کہ اس میں سے ہم دن کو کھینچ لیتے ہیں تو اس وقت ان

اپنے اپنے دائرے میں تیر رہے ہیں۔

کائنات کا یہ لگا بندھا نظام کسی اندھے کی لاٹھی نہیں کہ یونہی ایک مدت تک چلتا رہے اور پھر بغیر کسی نتیجہ کے معدوم ہو جائے۔ کائنات کی کوئی شئی تکوینی نظام سے منحرف نہیں ہے۔ قرآن نے علامتی طور پر زمین و آسمان کی اطاعت کو بیان کیا ہے جو اس امر کی دلیل ہے کہ پوری کائنات اپنے خالق کی مطیع و تابع فرمان ہے اور جہاں جہاں جس جس کو جیسا حکم ملا ہے اس کے مطابق سرگرم عمل ہے۔ انسان ابھی تک کائناتی قوانین ہی کے انکشاف میں لگا ہوا ہے اور ابھی تک اس کی کنہ تک نہیں پہنچ سکا جب بھی کوئی انکشاف ہوتا ہے تو تکوینی نظام کی حقانیت اور زیادہ مبرہن ہوتی ہے۔ کائنات کا اپنے خالق کے سامنے سرنگوں رہنا کائناتی حقیقت ہے جسے قرآن نے وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّ كَرْهًا وَّاِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ (۹۰)

کیا یہ لوگ اللہ کے دین کے سوا کسی اور دین کے طالب ہیں حالانکہ سب اہل آسمان و زمین خوشی یا زبردستی سے اللہ ہی کے فرمانبردار ہیں اور اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔

وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّ كَرْهًا وَّظِلٰلُهُمْ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ (۹۱)

اور جتنی مخلوقات آسمانوں اور زمین میں ہے خوشی یا زبردستی سے اللہ کے آگے سجدہ کرتی ہے اور ان کے سائے بھی صبح و شام سجدہ کرتے ہیں۔

تخلیق کائنات کا ذکر کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے:

قُلْ اَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِىْ خَلَقَ الْاَرْضَ فِىْ يَوْمَيْنِ وَ تَجْعَلُوْنَ لَهٗٓ اَنْدَادًا ذٰلِكَ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَO وَجَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِىَ مِنْ فَوْقِهَا وَبٰرَكَ فِيْهَا وَقَدَّرَ فِيْهَآ اَقْوَاتَهَا فِىْ اَرْبَعَةِ اَيَّامٍ سَوَآءً لِّلسَّآئِلِيْنَO ثُمَّ اسْتَوٰىٓ اِلَى السَّمَآءِ وَهِىَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَلِلْاَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا اَوْكَرْهًا قَالَتَا اَتَيْنَا طَآئِعِيْنَOفَقَضٰهُنَّ سَبْعَ سَمٰوَاتٍ فِىْ يَوْمَيْنِ وَاَوْحٰى فِىْ كُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَهَا وَزَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ وَ حِفْظًا ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِO (۹۲)

اور زمین میں برکت رکھی اور اس میں سامان معیشت مقرر کیا چار دن میں اور تمام طلبگاروں کے لیے یکساں ہے۔ پھر آسمان کی طرف متوجہ ہوا اور وہ دھواں تھا تو اس نے اس سے اور زمین سے فرمایا کہ دونوں آؤ خوشی سے یا ناخوشی سے۔ انہوں نے کہا ہم خوشی سے آتے ہیں۔ پھر دو دن میں سات آسمان بنائے اور ہر آسمان میں اس کے کام کا حکم بھیجا۔ اور ہم نے آسمان دنیا کو چراغوں (ستاروں) سے مزین کیا اور محفوظ رکھا۔ یہ زبر دست اور خبر دار کے اندازے ہیں۔

ان آیات سے واضح ہوتا ہے کہ کائنات تکوینی قوانین کے ذریعہ اللہ کے حکم کی پابند ہے۔ جب تک وہ چاہے گا یہ نظام چلے گا اور جب اسے منظور ہو گا وہ اسے بدل دے گا۔ کائنات کا نظام وجود خالق کا مرہون منت ہے اور اس کی بقا بھی امر ربی پر منحصر ہے۔ اس نے کہا ہے کہ وقت آئے گا جب یہ سارا نظام بدل جائے گا اور نیا نظام قائم ہو گا۔ یہ ربانی صداقتوں میں سے ایک صداقت ہے۔ اس کا ارشاد ہے۔

يَوۡمَ تُبَدَّلُ الۡاَرۡضُ غَيۡرَ الۡاَرۡضِ وَالسَّمٰوٰتُ وَ بَرَزُوۡا لِلّٰهِ الۡوَاحِدِ الۡقَهَّارِ (٩٣)

جس دن زمین دوسری زمین سے بدل جائے گی اور آسمان بھی اور سب لوگ اللہ یکتا وزبر دست کے سامنے نکل کھڑے ہونگے۔

انسان اور کائنات دونوں رب تعالیٰ کی مخلوق اور اس کے احکام کی پابند ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ کائنات تکوینی قوانین میں جکڑی ہوئی اسے اختیار و ارادہ کی قوت حاصل نہیں ہے جبکہ انسان صاحب اختیار و ارادہ ہے۔ اسی لیے احکام الٰہی کی خلاف ورزی کرتا ہے۔ دنیا میں بھی اس کا خمیازہ بھگت رہا ہے اور آخرت میں بھی مجرم کے طور پر پیش ہو گا۔ قرآن نے اس کا نقشہ کچھ اس طرح کھینچا ہے۔

وَتَرَى الۡمُجۡرِمِيۡنَ يَوۡمَئِذٍ مُّقَرَّنِيۡنَ فِى الۡاَصۡفَادِo سَرَابِيۡلُهُمۡ مِّنۡ قَطِرَانٍ وَّتَغۡشٰى وُجُوۡهَهُمُ النَّارُoلِيَجۡزِىَ اللّٰهُ كُلَّ نَفۡسٍ مَّا كَسَبَتۡ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيۡعُ الۡحِسَابِo (٩٤)

اس دن تم مجرموں کو دیکھو گے کہ زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ ان کے کرتے گندھک کے ہونگے اور ان کے چہروں کو آگ لپٹ رہی ہو گی یہ اس لیے کہ اللہ ہر شخص کو اس کے اعمال کا بدلہ

استفادہ کرے لیکن اگر وہ اسے تباہ کرنے کی کوشش کرے گا تو خود بھی تباہ ہو جائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو عقل اور طاقت عطا کی ہے اسے بروئے کار لا کر وہ اشیاء کائنات پر کنٹرول حاصل کرے اسے اپنی منفعت میں استعمال کرے۔ اسلامی نقطہ نظر سے کائنات نہ تو الٰہی قوت سے متصف ہے کہ انسان اس کی پرستش کرے اور نہ ہی انسان کی دشمن ہے کہ اسے مغلوب کرنے اور نقصان پہنچانے کے درپے ہو۔ ان دونوں رویوں سے اسے نقصان پہنچے گا۔ کائنات اللہ کی تخلیق کا شہکار ہے اور اس کے اندر ایک نظم اور ایک قانون کام کر رہا ہے۔ اس کے نظم کو قائم رکھنا اور اس کے قانون کی معرفت حاصل کرنا انسان کے فائدے میں ہے۔ انسان اور کائنات کا یہ رشتہ صرف اسلام ہی کے ذریعہ معلوم ہو سکتا ہے۔ یہ متوازن رویہ قرآن ہی نے متعارف کرایا ہے اور انسان کو بالآخر اس متوازن رویے کی طرف آنا ہوگا۔

انسان اور انسان

اسلام انسان اور انسان کے تعلق کو بھی مثبت انداز سے دیکھتا ہے اس کا تصور یہ ہے کہ انسان کی ابتداء ایک انسان کی تخلیق سے ہوئی اور اس کے بعد وہ برادریوں، قبیلوں اور نسلوں اور قوموں میں پھیلا پھولا ہے۔ لہٰذا ایک انسان دوسرے انسان کے لئے بھیڑیا نہیں بھائی ہے۔ قرآن نے انسانیت کو وحدت و اخوت کی بنیاد قرار دیا ہے۔ قرآن کہتا ہے:

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِىْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا٥ (٩٥)

لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرو جس نے تم کو ایک شخص سے پیدا کیا اس سے اس کا جوڑا بنایا پھر ان دونوں سے بکثرت مرد و عورت پھیلا دیئے اور اللہ سے جس کے نام کو تم اپنی حاجت براری کا ذریعہ بناتے ہو ڈرو اور قطع رحمی سے بچو کچھ شک نہیں کہ اللہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَاللّٰهِ اَتْقٰكُمْ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ (٩٦)

لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہاری قومیں اور قبیلے بنائے تاکہ ایک

اسلامی نقطہ نظر سے انسان کا انسان سے تعلق ان تین اصولوں سے طے ہوتا ہے ایک یہ کہ انسان کی بنیاد ایک مرد اور عورت ہے دوسرے یہ کہ قومیں و قبیلے پہچان کا ذریعہ ہیں اور تیسرے یہ کہ انسان کی اصل قیمت اس کا کردار ہے جو درست علم اور اچھے عمل سے متعین ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ تمام باتیں جاہلیت کی باتیں ہیں۔ حضور اکرمؐ نے جس جاہلی معاشرے میں دعوت الی اللہ کا کام شروع کیا تھا اس میں نسلی امتیازات کا تصور ایک مسلمہ عقیدہ تھا۔ انسان کی قدر و قیمت اس کے خاندانی اور نسلی پس منظر سے متعین ہوتی تھی۔ آپ نے سب سے پہلے ان امتیازات کے خلاف آواز اٹھائی۔ نسل پرستی کی وجہ سے انسان ہی انسان کی تذلیل کرتا ہے، اور انسان کے ہاتھوں ہی انسانیت بے وقار ہوتی ہے۔ دور حاضر جسے نیشنلزم کا نام دیتا ہے وہی تو Racisn ہے بس اسے ذرا خوشنما لباس پہنا دیا گیا ہے۔ آنحضرتؐ کے ارشادات انسانیت کی اس تذلیل کے خلاف منقول ہیں۔ آپ نے فرمایا:

یا معشر قریش ان اللہ قد اذھب عنکم نخوۃ الجاھلیہ و تعظمھا بالآباء۔ الناس من آدم و آدم من تراب۔(۹۷)

اے گروہ قریش اللہ نے تم سے جاہلیت کے غرور اور آباء پر فخر کرنے کو رد کر دیا۔ لوگ آدم سے ہیں اور آدم مٹی سے ہے۔

امام ترمذی نے اسی بات کو ذرا مختلف الفاظ میں نقل کیا ہے۔ ابن عمرؓ کہ رسول اللہ ﷺ نے فتح مکہ کے موقع پر لوگوں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

ان اللہ قد اذھب عنکم عصبیۃ الجاھلیۃ و تعاظمھا بابائھا۔ فالناس رجلان رجل بَرٌّ تقی کریم علی اللہ وفاجر شقی ھَیِّنٌ علی اللہ۔ والناس بنو آدم و آدم من تراب۔(۹۸)

بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے تم سے جاہلیت کا غرور اور آباء پر فخر کرنے کو چھین لیا ہے۔ لوگ دو قسم کے ہیں۔ ایک شخص نیک متقی اور اللہ کے ہاں مکرم ہے دوسرا فاجر' بدبخت اور اللہ کے ہاں بے وزن ہے۔ لوگ آدم کی اولاد ہیں اور آدم مٹی سے ہے۔

نسلی امتیازات کے اصول کی نفی کرتے ہوئے حضور اکرم ﷺ نے واضح الفاظ میں مساوات انسانی کا اصول عطا فرمایا! آپ نے فرمایا:

انسان پر انسان کے ظلم کی ایک مثال غلامی کی رسم ہے۔ پوری انسانی تاریخ غلامی کی تاریخ ہے۔ یونان، روم، ایران، مصر اور ہندوستان کے معاشرے غلامی کی بد نما رسم کو قائم رکھنے والے اور اسے فروغ دینے والے تھے۔ یہ اسلام تھا جس نے اس ظالمانہ رسم کو ختم کرنے کی مثبت کوششیں کی۔ اسلام کے آغاز کے وقت تین قسم کی غلامی رائج تھی۔ غلاموں کی بڑی تعداد موجود تھی جو بکتے بکاتے معاشرے کا حصہ تھے۔ جنگی قیدی جنہیں بیچ دیا جاتا تھا اور آزاد افراد کو پکڑ کر غلام بنا لیا جاتا تھا۔ حضور اکرمؐ نے تینوں قسموں کے بارے میں انقلابی پالیسی اختیار کی۔ جو غلام موجود تھے ان کی آزادی کی حوصلہ افزائی کی آپ نے خود غلام خرید کر آزاد کیے۔ دینی امور کی خلاف ورزی پر سزاو تاوان کی صورت میں غلاموں کی آزادی متعین کی۔ جنگی قیدیوں کی تادان پر یا بغیر تاوان آزادی کی حوصلہ افزائی کی اور آزاد انسان کو غلام بنانے کی سخت ممانعت کی۔ آپ نے فرمایا:

من اعتق رقبةً مُومَنةً كانَتْ فِداءُ ہ مِنَ النَّار(۱۱۰)

جس شخص نے ایک مومن کی گردن آزاد کرائی وہ اس کے لیے آگ کے بچاؤ کا ذریعہ ہو گی۔

چونکہ معاشرے سے غلامی کو بتدریج ختم کرنے کی منصوبہ بندی کی گئی تھی اس لیے ایسے اقدامات کیے گئے جن سے غلاموں کو عزت ملے۔ معاشرے میں موجود غلاموں کو معزز مرتبہ دینے کی ترغیب دی آپ نے فرمایا:

ان اخوانكم خَوَلُكم جعلهم الله تحت ايديكم فمن كان اخوه تحت يده فليطعمه مما يا كل وليلبسه مما يلبس ولا تكلفوهم مايَغْلِبُهم فاعينوهم(۱۰۱)

تمہارے خدمت گزار تمہارے بھائی ہیں جنہیں اللہ نے تمہارے ماتحت کر دیا ہے اس لیے جس کا بھائی اس کے تحت ہو تو اس کو وہی کھلائے جو خود کھاتا ہے اور وہی پہنائے جو خود پہنتا ہے ان کو ایسے کام کی تکلیف نہ دو جو ان سے نہ ہو سکے اگر ان کو تکلیف دو تو ان کی مدد کرو۔

انسان اور انسان کے تعلق میں عدل و احسان کے اصولوں کو متعارف کرایا اور ظلم کو حرام قرار دیا۔

جس نے ظالم کے ساتھ اس کی اعانت کی خاطر قدم اٹھایا اور وہ اسے جانتا ہے کہ وہ ظالم ہے تو وہ اسلام سے خارج ہو گیا۔

قرآن نے عدل و احسان کے بارے میں اللہ کا یہ حکم ریکارڈ کیا ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ (۱۰۳) اللہ تم کو عدل و احسان کا حکم دیتا ہے۔

دور حاضر میں انسان کے مسائل کی بنیادی وجہ وحی کے نور سے بے نیازی اور احکام الٰہی کے بارے میں جہالت ہے۔ اسلام نے انسانی تعلقات میں بنیادی اصول متعارف کرائے ہیں جس سے انسانی معاشرہ ایک مثالی معاشرہ بن سکتا ہے۔ کافروں نے تو اپنی جہالت اور انکار کی وجہ سے ان اصولوں سے انحراف کیا ہے۔ بدقسمتی سے مسلمانوں نے بھی ان اصولوں کو نہیں اپنایا اور انتہائی ڈھٹائی سے کافرانہ رسموں اور جاہلانہ اصولوں کو پسند کیا ہے۔ نتیجہ ہر طرف فساد ہی فساد ہے۔

ان پہلوؤں کو واضح کرنے کے بعد قرآن عظمت انسان کا تصور بھی دیتا ہے جس سے انسان کی صحیح حیثیت اور مقام کا تعین ہوتا ہے۔ اسلام کے نزدیک انسان اول و آخر انسان ہے اور انسان رہنے ہی میں اس کی عظمت ہے۔ خدا بننے کی کوشش یا حیوانی سطح پر آنے کی کاوش اس کے مقام و مرتبہ کے منافی ہے۔ اگر وہ انسانی مرتبہ کو پہچانے اور اس پر قائم رہے تو اللہ کے بعد کائنات میں اسی کا مرتبہ ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کی اعلیٰ ترین مخلوق ہے۔ جس طرح انسان اور خدا' انسان اور کائنات اور انسان اور انسان کے تعلق کے حوالے سے یہ ثابت ہوا کہ انسان معزز و محترم ہے اور اسے افراط سے بچنا چاہئے اسی طرح عظمت انسان کے مثبت تصور سے بھی قرآن یہی ثابت کرتا ہے کہ انسان عظیم ہے۔ اور کائنات کا گل سرسبد اور اللہ تعالیٰ کی پسندیدہ مخلوق ہے۔ قرآن و سنت نے مثبت انداز میں عظمت انسان کا تصور دیا ہے۔ ایسے ارشادات و نصوص موجود ہیں جن سے مقام انسان کا پتہ چلتا ہے مثلاً:

وَلَقَدْ کَرَّمْنَا بَنِیْٓ اٰدَمَ وَ حَمَلْنٰھُمْ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰھُمْ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ وَ فَضَّلْنٰھُمْ عَلٰی کَثِیْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِیْلًا (۱۰۴)

اور ہم نے آدم کی اولاد کو عزت دی اور ہم نے ان کو خشکی اور دریا میں سوار کیا اور نفیس نفیس چیزیں ان کو عطا فرمائیں اور ہم نے ان کو اپنی بہت سی مخلوقات پر فوقیت دی۔

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ (١٠٦)

اور جس وقت حکم دیا ہم نے فرشتوں کو (اور جنوں کو بھی) کہ سجدے میں گر جاؤ آدمؑ کے سامنے تو ابلیس کے سوا سب سجدے میں گر پڑے۔

احادیث

حضور اکرم ﷺ کے ارشادات میں انسانی شخصیت کی تکریم کا خصوصی ذکر ملتا ہے۔ چہرہ انسانی شخصیت کی علامت اور پہچان ہے۔ احترام آدمیت میں چہرے کو خاص اہمیت دی۔ آپ ﷺ سے منقول ہے:

خلق الله آدم علی صورته (١٠٧) اللہ نے آدمؑ کو اپنی صورت پر پیدا کیا۔

عن ابی ہریرةؓ قال: قال رسول اللّٰه ﷺ: اذا ضرب احدکم خادمه فلیتق الوجه (١٠٨)

وفی روایة ان رسول الله ﷺ قال: اذا قاتل احد کم فَلْيَجْتَنِب الوجه۔ (١٠٩)

جب تم میں سے کوئی اپنے خادم کو سزا دے تو چہرے پر نہ مارے اور ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی لڑائی کرے تو اسے چہرے کو نشانہ نہیں بنانا چاہیے۔

عن ابی ہریرة قال: قال رسول الله ﷺ اذا قاتل احدکم اخاه فلیجتنب الوجه (١١٠)

جب تم میں سے کوئی اپنے بھائی سے لڑے تو اس کے چہرے پر وار نہیں کرنا۔

عن ابی ہریرة قال لا تقولن قبح الله وجهك .... فان الله خلق آدم علی صورته (١١١)

وفی روایة قال: لا تقولوا قبح الله وجهه۔

یہ نہیں کہنا چاہئے کہ خدا تیرے چہرے کو بگاڑے کہ خدا نے آدمؑ کو اپنی صورت پر پیدا کیا ہے اور ایک روایت میں ہے کہ آپ ؐ نے فرمایا: یہ نہ کہو کہ اللہ اس کے چہرے کو بگاڑے۔

ان آیات میں انسانی فضیلت و عظمت کو بیان کیا گیا ہے۔ ایسی فضیلت جس میں اور کوئی مخلوق اس کی شریک نہیں۔ احادیث سے بھی اظہار فضیلت ہی مراد ہے اور انسان کے چہرے کی تعظیم اس کی فضیلت کی وجہ سے ہے۔ انسان کی صورت کو خدائی صورت سے تشبیہ بھی دراصل بیان فضیلت

صاحب فضیلت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی اس شان کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا تھا اور فرشتوں کے اعتراض پر انسان کی حمایت میں فرمایا تھا۔ **اِنِّیٓ اَعْلَمُ مَالَا تَعْلَمُوْنَ۔**[۱۱۲] کائنات کی کوئی اور مخلوق اس فضیلت میں انسان کی شریک نہیں۔ انسان کے سوا کوئی بھی خلافت کے اہل نہیں۔ قرآن پاک نے اسے امانت قرار دیا ہے اور انسان کو اس کا امین' کیونکہ ساری مخلوق نے بار امانت اٹھانے سے انکار کردیا تھا۔ بقول شاعر:

آسماں بار امانت نتوانست کشید　　　قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند

ارشاد باری ہے:

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَۃَ عَلَی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ الْجِبَالِ فَاَبَیْنَ اَنْ یَّحْمِلْنَہَا وَاَشْفَقْنَ مِنْہَا وَحَمَلَہَا الْاِنْسَانُ اِنَّہٗ کَانَ ظَلُوْمًا جَہُوْلًا[۱۱۳]

ہم نے یہ امانت آسمان زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کی تو انہوں نے اس کی ذمہ داری سے انکار کر دیا اور اس سے ڈر گئے۔ اور انسان نے اس کو اپنے ذمہ لے لیا۔ وہ ظالم ہے جاہل ہے۔

اس آیت میں لفظ امانت توجہ کا محتاج ہے۔ علماء نے اس کی مختلف توجیہات بیان کی ہیں۔ ہم یہاں صرف دو ایک نقل کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ شاہ ولی اللہؒ نے حجۃ اللہ البالغہ میں ایک مستقل باب باندھا ہے اور اس آیت کی پوری تشریح و تفسیر کی ہے۔ شاہ صاحب نے امام غزالیؒ اور قاضی بیضاویؒ کے حوالے سے امانت کے معنی ''تکلیف شرعی'' بیان کئے ہیں اور **ظلوماً جھولا** کی تعبیر میں اس طرح رقمطراز ہیں:

''میں کہتا ہوں اس معنی کے اعتبار سے **انہ کان ظلوماً جھولا** گویا تعلیل و سبب کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ کیونکہ ظالم اس کو کہتے ہیں جو عدل و انصاف نہ کرے لیکن اس کی شان یہ ہے کہ وہ عدل و انصاف کر سکتا ہے اور جاہل وہ ہے کہ عالم نہ ہو لیکن اس کی شان یہ ہے کہ وہ عالم ہو سکتا ہے۔ انسان کے سوا جس قدر بھی مخلوق ہے یا تو وہ سراسر عالم و عادل ہے' اس میں ظلم و جہالت نام کو بھی نہیں جیسے ملائکہ یا وہ ہے کہ اس کے اندر نہ تو عدل و انصاف ہے اور نہ وہ علم

آگے چل کر شاہ صاحب قوت ملکیہ اور قوت بہیمیہ کا ذکر فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو دو قوتیں عطا فرمائی ہیں اور دونوں کے مطابق ڈھل جانے کی اسے صلاحیت دی۔ اگر وہ قوت ملکیہ کو اپنائے تو اللہ تعالیٰ آسانیاں مہیا کرتا ہے اور اگر قوت بہیمیہ اس پر غالب آ جائے غلط راہوں پر چل پڑے تو اللہ تعالیٰ رکاوٹیں نہیں ڈالتا اور انسان انجام کار سزا کا مستحق قرار پاتا ہے۔

قرآن اس اختیار کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے:

فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰی وَاتَّقٰیo وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰیO فَسَنُیَسِّرُهٗ لِلْیُسْرٰیO وَاَمَّا مَنْ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰیO وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰی فَسَنُیَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰیO(۱۱۵)

سو جس نے (اللہ کی راہ میں مال) دیا اور اللہ سے ڈرا اور اچھی بات کو سچا سمجھا تو ہم اس کو آسان طریقے کی توفیق دیں گے۔ اور جس نے بخل کیا اور بے پروائی اختیار کی اور اچھی بات کو جھٹلایا تو ہم اس کو تکالیف کی چیز کے لیے سامان دے دیں گے۔

كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَ هٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا(۱۱۶)

آپ کے رب کی عطاء میں سے تو ہم ان کی بھی امداد کرتے ہیں اور ان کی بھی اور آپ کے رب کی عطاء کسی پر بند نہیں۔

محقق دوانی نے اخلاق جلالی میں امانت کی تشریح کچھ تنقیدی انداز میں کی ہے۔ انہوں نے تکلیف شرعی کے مفہوم کو نا درست قرار دیا ہے کیونکہ مکلّف تو جن بھی ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ یہاں امانت سے مراد نیابت خداوندی اور خلافت الٰہی ہے۔ دوانی کی بات زیادہ وزنی معلوم ہوتی ہے کیونکہ مکلّف قرار دیئے جانے میں انسانی فضیلت کا کوئی خاص اظہار نہیں ہوتا۔(۱۱۷) جب کہ خلافت مراد لینے سے انسانی عظمت مثبت طور پر ظاہر ہوتی ہے۔ قرآن پاک میں اس مفہوم کو پوری تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً(۱۱۸)

اور جس وقت ارشاد فرمایا آپ کے رب نے فرشتوں سے کہ ضرور میں زمین میں ایک نائب بنادوں گا

عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اِنَّ الَّذِيْنَ يَضِلُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ بِمَا نَسُوْا يَوْمَ الْحِسَابِ(۱۱۹)

اے داؤد ہم نے تم کو زمین پر حاکم بنایا ہے تو لوگوں میں انصاف کے ساتھ فیصلہ کرتے رہنا۔ اور آئندہ بھی نفسانی خواہش کی پیروی مت کرنا کہ وہ خدا کے راستہ سے تم کو بھٹکا دے گی۔ جو لوگ خدا کے رستے سے بھٹکتے ہیں ان کے لیے سخت عذاب ہو گا۔ اس وجہ سے کہ وہ روز حساب کو بھولے رہے۔

قَالَ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّهْلِكَ عَدُوَّكُمْ وَ يَسْتَخْلِفَكُمْ فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ(۱۲۰)

موسیٰ نے فرمایا: بہت جلد اللہ تعالیٰ تمہارے دشمن کو ہلاک کردیں گے اور بجائے ان کے تم کو اس سرزمین کا مالک بنا دیں گے پھر تمہارا طرزعمل دیکھیں گے۔

وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَبْلُوَكُمْ فِیْ مَآ اٰتٰكُمْ(۱۲۱)

اور وہ ایسا ہے جس نے تم کو زمین میں صاحب اختیار بنایا اور ایک کا دوسرے پر رتبہ بڑھایا تاکہ تم کو آزمائے ان چیزوں میں جو کہ تم کو دی ہیں۔

تکلیف شرعی صرف اطاعت احکام سے آتی ہے جو انفرادی عمل ہے اور خلافت میں نفاذ احکام بھی شامل ہے۔ عظمت انسان اس پر ہے کہ وہ ایک اجتماعی نظام تشکیل دے جس میں احکام خدا وندی کا نفاذ شعوری ہو۔ یہی اس کا کمال ہے اور اسی کی وجہ سے اسے مسجود الملائکہ بنایا گیا۔ اس توضیح کے لحاظ سے **فحملها الانسان** کا ترجمہ **خانها الانسان** ہو گا یعنی انسان نے ذمہ داری قبول کرنے کے بعد اسے نباہا نہیں۔ نفس اور شیطان کی اطاعت میں خدا سے غافل ہو گیا اور ظالم و جاہل ٹھہرا۔ اس کا صحیح کام یہ ہے کہ وہ اللہ کا بندہ بن کر رہے اور لوگوں کو خدا کی بندگی کی طرف دعوت دے۔ خدا کی بندگی کا نظام مستحکم کر کے لوگوں کو اس میں شامل کرے۔ اسے یہ حق نہیں پہنچتا کہ خود خدا بن بیٹھے اور خلق خدا کو اپنا محکوم بنا لے۔

غلط فہمی کا ازالہ

عظمت انسان سے کہیں یہ غلط فہمی نہ ہو کہ کسی مخصوص طبقہ کی عظمت مراد ہے۔ گو اسلام عظمت کا صحیح مدار تقویٰ و دین ہی قرار دیتا ہے لیکن مطلق مخلوق کے لحاظ سے بھی اس کی فضیلت کا اعتراف

سے وابستہ تصور غلط ہے اس غلط احساس عظمت اور ناقص تصور شرف نے دنیا کو ظلم کدہ بنا دیا ہے قرآن نے اسی کی طرف اشارہ کیا ہے۔

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ (۱۲۲)

لوگوں کے کرتوتوں کی وجہ سے بحر و بر میں فساد رونما ہوا۔

اسلام انسانی شرف کے لحاظ سے سب کو مساوی قرار دیتا ہے۔ کسی شخص کو اظہار فضیلت کا ایسا کوئی حق نہیں جس سے فساد بپا ہو اور جس کی بنیاد باطل ہو۔ آنحضرت نے فخر و مباہات اور عصبیۃ جاہلیہ کو ملعون قرار دیا تو اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ حاکم و محکوم' آقا و غلام اور اشرف و ارزل کی تمیز اٹھ گئی اور انسان اپنے اصلی مقام پر آ گیا۔ وہ مصنوعی حد بندیاں جنہیں وضع کر لیا گیا تھا ٹوٹ گئیں اور انسان ایک مرتبہ پھر انسانی شرافت کا متحمل اور عظمت آدمیت کا رفیق ہو گیا۔ حضور کے مندرجہ ذیل ارشادات بطور دلیل پیش کئے جا سکتے ہیں:

عن عیاض بن حمار المجاشعی ان رسول الله ﷺ قال: ان الله تعالیٰ اوحی اِلیّ ان تواضعوا حتی لا یبغی احد علی اَحَدٌ ولا یَفخر احد علی احد (۱۲۳)

عیاض بن حمار مجاشعیؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: یقیناً اللہ نے میری طرف وحی کی کہ تم فروتنی اختیار کرو حتی کہ کوئی کسی پر بڑائی نہ جتائے اور کوئی کسی پر دراز دستی نہ کرے۔

عن ابی هریره قال: قال رسول الله ﷺ: لینتهین اقوام یفتخرون بآباء هم الذین ماتوا انما هم فحم من جنهم او لیکونن اهون علی الله من الجعل الذی یدهده الخراء بانفه۔ ان الله قد اذهب عنکم عبیة الجاهلیه وفخرها بالآباء انها هو مؤمن تقی و فاجر شقی۔ الناس کلهم بنوآدم و آدم من تراب (۱۲۴)

ابو ہریرہؓ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: جو لوگ اپنے مرے ہوئے آباء پر فخر کرتے ہیں انہیں باز آ جانا چاہئے وہ فقط دوزخ کے کوئلے ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے

عن جبیرؓ بن مطعم اَنَّ رسول الله ﷺ قال: لیس منا مَن دَعَا اِلی عصبیة ولیس منا من مات علی عصبیة(۱۲۵)

جبیر بن مطعمؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس نے عصبیت کی طرف بلایا وہ ہم میں سے نہیں۔ جس نے عصبیت پر جنگ کی وہ ہم میں سے نہیں اورجس نے عصبیت پر جان دی وہ ہم میں سے نہیں۔

قال رسول الله ﷺ لا فضل لعربی علی عجمی ولا لاحمر علی اسود الا بالتقوی(۱۲۶)

نبی ﷺ نے فرمایا کہ کسی عربی کو کسی عجمی پر فضیلت نہیں اور نہ کسی گورے کو کسی کالے پر سوائے تقویٰ کے۔

ان تمام احادیث میں فضیلت کے غلط تصور کو مٹایا گیا اور مساوات انسانی کو مستحکم کیا گیا ہے۔ ہر انسان پیدائشی طور پر دوسرے کے برابر ہے۔ فرق صرف اخلاق و تقویٰ اور صلاحیتوں کا ہے اس قدرتی اور اکتسابی فرق کے سوا جملہ تفریق مصنوعی ہے اورنسل انسانی کے لیے باعث ہلاکت ہے۔

عن أبی هريرة قال. قال رسول الله ﷺ ان الله قد أذهب عنكم عصبية الجاهلية وفخرها بالآباء. مومن تقی وفاجر شقی انتم بنو آدم و آدم من تراب لید عن رِجال فخرهم باقوامه انماهم فحم من فحم جهنم اولیکونن اهون علی الله من الجعلان ألتی تدفع بانفها النتن.(۱۲۷)

ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ نے جاہلیت کی نخوت اور آباؤ اجداد کے ساتھ فخر کرنے کو تم سے دور کر دیا ہے۔ اب تو متقی مومن شخص ہے یا فاجر بدکار ہے تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے ۔ لوگ اپنے آباؤ اجداد کے ذریعہ فخر کرنے سے باز رہیں وہ جہنم کے کوئلوں میں سے کوئلے ہیں۔ ورنہ اللہ تعالیٰ کے ہاں گندگی کے کرم سے بھی ذلیل تر ہو جائیں گے جو اپنی ناک سے نجاست دھکیلتا ہے۔

حواشی و حوالہ جات

(۴) Ibid / 49.

(۵) The Meaning of Evolutional 137 - 39.

(۶) Social Pychology.

(۷) قرآن اور علم جدید / ۲۴۴

(۸) Ouspensky- Tertium organum.

(۹) In Search of the Miraculous / 53.

(۱۰) Ibid / 108.

(۱۱) Brightman, philosophy of Religion / 200.

(۱۲) Ibid / 196.

(۱۳) The Divine and Human.

(۱۴) Guide to Morals and Politics / 250.

(۱۵) The Reconstruction of Religious Thought in Islam / 41-15.

(۱۶) رومیوں، ۵/۴۳۔ ۴۶

(۱۷) The Enchiridian, 1/687.

(۱۸) Christianity and World Religion / 212.

(۱۹) یہ تعریفات ہم نے ای۔ ایس۔ برائٹ مین (E. S. Brightman) کی کتاب Philosophy of Religion سے لی ہیں۔دیکھئے صفحات: ۸۹۔ ۸۱

(۲۰) اس کے نزدیک کائنات ارتقاء پذیر ہے۔ جونہی کائنات ایک منزل طے کرتی تو Dietyدوسری منزل پہ ہوتی ہے۔ (Time and Diety)۔

(۲۱) Philosophical basis of Biology / 21.

(۲۲) Philosophy of Religion / 94.

(۲۳) Theistic Monism / 329.

(۲۴) Science and personality / 81.

(۲۵) My Conception of God.

(۲۶) An introduction to the philosophy of Religion / 229-2.

(۲۷) Creative Evolution / 36.

(۲۸) The Divine and the Human /52.

(۲۹) I and Thou / 82.

(۳۰) Reconstruction of Religious Thought in Islam /12.

(۳۱) الرعد/۱۱

(۳۲) Reconstruction of Religious thought in Islam / 12.

(۳۶) In Search of Miraculous / 75.

(۳۷) A New Model of Universe / 18.

(۳۸) The Divine and Human / 53.

(۳۹) Russel Birtand, Mysticism and Logic.

(۴۰) The Riddle of the universe /12 - 13.

(۴۱) The Problem of Individuality / 63 - 64.

(۴۲) Design and pruspose / 59.

(۴۳) Ibid.

(۴۴) Rig- veda, x, 129, 2.

(۴۵) Christianity and other Religious / 205

یہ امر دلچسپی سے خالی نہ ہو گا کہ عیسائی واہب بھی دنیا کو اسی طرح ناپاک سمجھتے تھے جیسے ہندو یوگی یا بدھ راہب پھر مذہب و ریاست کی تفریق اور مذہب کو ذاتی تجربے تک محدود کرنے کے تصورات تو عیسائی علم کلام میں واضح طور پر موجود ہیں۔

(۴۶) Ibid

آخری جملے پر غور کریں۔ یہ مخصوص مسیحی مبہم انداز بیان ہے جو عقیدہ کی وضاحت کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ ''کوئی خدا کے اندر بھی نہں اور باہر بھی نہیں'' کا جملہ عقیدہ تثلیث کی طرف اشارہ ہے۔ اسی طرح وہ اسی عقیدے کی توضیح کرتے ہیں۔

(۴۷) Ibid/207

(۴۸) قرآن اور علم جدید/۹۹

(۴۹) Creative Freedom / 28.

(۵۰) Christianity and other religions / 248 - 49.

(۵۱) Reconstruction of Man/104.

(۵۲) William & Branden, the Indian Removal, The American Hritage, book of Indians, New York 1961.

(۵۳) الاعراف/۱۱

(۵۴) تفہیم القرآن؛ ۲/۱۰

(۵۵) ص/۷۱۔۷۲

(۵۶) الحجر/ ۲۸۔۲۹

(۵۷) تفہیم القرآن، ۲/۱۰۔۱۱

(۵۸) الحجر/۲۶۔۲۹

(۵۹) بخاری، کتاب الادب، باب جعل اللہ الرحمۃ فی مائۃ جزء/۱۰۵۰؛ مسلم، کتاب التوبہ، باب فی سعۃ رحمۃ اللہ/۱۱۹۳

(۶۳) المومنون/ ۱۱۵تا ۱۱۷
(۶۴) الکہف/ ۴۵، ۴۶
(۶۵) الانفطار/ ۶، ۸
(۶۶) الحج/ ۵
(۶۷) یٰسین/ ۷۷، ۷۸
(۶۸) الواقعہ/ ۵۸۔ ۶۲
(۶۹) بنی اسرائیل/ ۶۷۔ ۶۹
(۷۰) عبس / ۱۷۔۱۹
(۷۱) الذاریات/ ۱۔ ۵۶
(۷۲) القیامہ/ ۳۶۔۴۰
(۷۳) البقرہ/ ۳۶
(۷۴) ایضاً/ ۳۸
(۷۵) الغافر/ ۱۷
(۷۶) الاسراء/۱۳۔ ۱۵
(۷۷) ایضاً / ۱۶۔ ۱۷
(۷۸) البقرہ/ ۲۔۵
(۷۹) الروم/ ۴۱
(۸۰) The Annihilation/170
(۸۱) البقرہ/ ۲۹
(۸۲) الحج/ ۶۵
(۸۳) النحل/ ۵۔ ۱۸
(۸۴) یٰس/ ۸۰
(۸۵) عبس/ ۲۴۔۳۲
(۸۶) اسلامی تہذیب اور س کے اصولو مبادی/۲۶
(۸۷) الدخان/ ۳۸۔ ۴۰
(۸۸) الروم/ ۸
(۸۹) یٰس/ ۳۶۔ ۴۰
(۹۰) آل عمران/ ۸۳
(۹۱) الرعد/ ۱۵
(۹۲) فصلت / ۹۔ ۱۲
(۹۳) ابراہیم / ۴۸

(۹۷) سیرہ، ۵۴/۴
(۹۸) ترمذی، ابواب التفسیر، ۱۵۹/۷
(۹۹) مسند احمد، ۴۱۱/۵
(۱۰۰) ابو داؤد، کتاب العتق ، باب الرقاب افضل، ۳۷۵/۴
(۱۰۱) بخاری، کتاب العتق، باب قول النبیؐ العبید اخوانکم، ۱۲۳/۳
(۱۰۲) ایک روایت میں لیقویہ کی جگہ لیعینہ ہے۔ کشف الخفاء، ۳۸۹/۲
(۱۰۳) النحل/ ۹۰
(۱۰۴) بنی اسرائیل/ ۷۰
(۱۰۵) التین/ ۴
(۱۰۶) البقرہ/ ۳۴
(۱۰۷) شرح السنۃ، ۲۵۶/۱۲
(۱۰۸) مشکاۃ، کتاب الاداب/ ۳۹۷
(۱۰۹) بخاری، کتاب العتق، ۳۶ ۷/۱
(۱۱۰) مسلم، ابواب البرو الصلہ باب النہی عن ضرب الوجہ، ۳۲۸/۲
(۱۱۱) الادب المفرد/۵۴۔ امام مسلمؒ نے ابی حاتمؒ سے حضورﷺ کی جو حدیث نقل کی ہے اس میں یہ الفاظ بھی ہیں فان الله خلق آدم علی صورته اور ابوہریرہؓ کی روایت ہے **فلا یلطمن الوجه** یعنی تھپڑ نہ مارے۔
(۱۱۲) البقرہ/۳۰
(۱۱۳) الاحزاب/۷۲
(۱۱۴) حجۃ اللہ البالغہ (اردو ترجمہ)، ۶۵/۱ مطبوعہ لاہور
(۱۱۵) اللیل/ ۵، ۱۰
(۱۱۶) بنی اسرائیل/۲۰
(۱۱۷) ایک اور دقت بھی پیش آتی ہے کہ ظلوماً جھولا کی دور ازکار تاویل کرنی پڑتی ہے ورنہ مفہوم یہ بنتا ہے کہ جس انسان نے بار امانت اٹھایا وہ بڑا ظالم و جاہل ہے۔عجیب بات ہے ایک طرف وہ بے چارہ بوجھ اٹھا رہا ہے دوسری طرف اسے صلہ یہ دیا جا رہا ہے کہ وہ بڑا ظالم و جاہل ہے۔
(۱۱۸) البقرہ/ ۳۰
(۱۱۹) ص/ ۲۶
(۱۲۰) الاعراف/ ۱۲۹
(۱۲۱) انعام/ ۱۶۵
(۱۲۲) الروم/ ۴۱
(۱۲۳) ابو داؤد، کتاب الادب ،باب فی التواضع، ۶۷۱/۲
(۱۲۴) ایضاً ،کتاب الادب باب التفاخر فی الانساب ،۶۹۷/۲